

زخم کوئی ہو

[illegible]

زخم کوئی ہو

مجموعۂ کلام

سُریندر پنڈت سوزؔ

مرتب

ناشرؔ نقوی

ہریانہ اُردو اکادمی، ۹۸۳، سیکٹر ۹، پنچکولہ، ہریانہ

● "زخم کوئی ہو" ۔ مجموعۂ کلام آنجہانی سریندر پنڈت سوز
● زیرنگرانی ۔ کشمیری لال ذاکر
● مرتب ۔ ناشر نقوی
● کتابت ۔ لقاءالرحمٰن
● تعداد ۔ پانچ سو
● سال اشاعت ۔ سنہ ۱۹۸۹ء
● تزئین سید عبدالحنان

سلسلہ ہریانوی ادب

قیمت ۔ ۲۸ روپے

کشمیری لال ذاکر سکریٹری ہریانہ اُردو اکادمی نے جے، کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے
چھپوا کر، ہریانہ اُردو اکادمی ۹۸۲۔ سیکٹر ۹ پنچکولہ (ہریانہ) سے شائع کیا

ترتیب

میں صندلی لباس ہوں، جلنے کے بعد بھی
سب راستوں پہ اپنی مہک چھوڑ جاؤں گا

دُعائیہ

ہریانہ کی دھرتی کئی تاریخی حوالوں سے گیان کی دھرتی کہی جاتی ہے۔ پانچ ہزار برس پہلے کوروکشیتر کے میدان میں بھگوان کرشن نے گیتا کا پوتر اُپدیش دیا تھا اور ہریانہ کے ہی سیہی گاؤں میں مہاکوی سورداس پیدا ہوئے۔ حالیؔ پانی پتی، خواجہ احمد عباس اور صالحہ عابد حسین کا بھی ہریانہ کی اسی دھرتی سے تعلق ہے۔ ہزاروں سال پُرانی تاریخ سے موجودہ عہد تک اُپدیشکوں، لیکھکوں، ادیبوں اور شاعروں کا سلسلہ وار ایک قافلہ ہے جو ادب اور تہذیب کی راہوں سے گزرتا رہا ہے۔ ہریانہ ایک روشن ماضی کا امانت دار ہے۔

ہریانہ اردو اکادمی اپنے صوبے کے اردو ادیبوں کی ادبی خدمات کو مختلف طریقوں سے عوام تک پہونچانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ اپنے قیام کے بعد سے ہریانہ اردو اکادمی نے بہت سے ہریانوی قلمکاروں کی کتابیں چھاپنے کے لیے مالی امداد دی اور خود بھی ان کی کتابیں چھاپیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہریانہ اردو اکادمی اردو زبان کی ترقی کے لیے مناسب قدم اُٹھا رہی ہے۔ آنجہانی سریندر پنڈت سوزؔ کا مجموعۂ کلام "زخم کوئی ہو" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ سوزؔ صاحب ہریانہ کے ایک نمائندہ جدید شاعر تھے اور برسوں "ٹریبیون" اخبار سے وابستہ رہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ ہریانہ اردو اکادمی نے سوزؔ صاحب کے مجموعۂ کلام کو شائع کر کے نہ صرف ایک ادبی خدمت انجام دی ہے بلکہ ایک اہم فرض بھی انجام دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں اکادمی کی اس کتاب کو معقول پذیرائی حاصل ہوگی۔

(شریمتی) سشما سوراج

وزیر تعلیم، حکومتِ ہریانہ، چنڈی گڑھ

حرفِ چند

ہریانہ اردو اکادمی کے اہم پروگراموں میں جہاں عوام کے درمیان اردو تعلیم کو فروغ دینا اور زبان و ادب سے متعلق ادبی تقاریب منعقد کرنا شامل ہے۔ وہاں ریاست کے اردو ادیبوں کی تخلیقات کو شائع کرنا بھی اس کا ایک اہم منصوبہ ہے۔ اسی منصوبے کے تحت اکادمی نے ریاستی ادیبوں اور شاعروں کی مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں بھی شائع کی ہیں اور انہیں اپنی کتابوں کو شائع کرنے کے لیے مالی امداد بھی دی ہے۔

زیرِ نظر کتاب "زخم کوئی ہو" ہریانہ کے جواں مرگ شاعر مہیندر پنڈت سوز کا مجموعہ کلام ہے۔ سوز صاحب ریاست کے ایک نمائندہ شاعر تھے جو اپنے شعری اور فکری سفر کے دوران دو برس پہلے اچانک انتقال فرما گئے۔ ان کے کلام میں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔

ہریانہ اردو اکادمی نے آنجہانی سوز کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ان کی منتخب شعری تخلیقات کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ کلامِ سوز کے علاوہ سوز صاحب کی شخصیت اور ان کے فنی و ادبی پس منظر تک پہونچنے کے لیے ابتدا میں چند مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ اس کتاب کا اکادمی کی دوسری مطبوعات کی طرح اردو حلقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا۔

(جناب) چودھری خورشید احمد

چیرمین ہریانہ اردو اکادمی

ابتدائیہ

مجھے خوشی ہے کہ ہریانہ اردو اکادمی ریاست میں اردو کی خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ چاہے اس کا تعلق قومی تناظر اور پس منظر سے ہو یا خاص ریاست ہریانہ اور اردو دنیا سے۔

پچھلے دنوں ہریانہ اردو اکادمی نے بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے متعلق ان کی تحریروں پر مشتمل ایک یادگار کتاب شائع کی تھی، جس کا اردو دنیا میں بجا طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ اور اب ریاست کے مشہور اخبار نویس، شاعر اور ادیب سریندر پنڈت سوز کی برسی پر انہیں خراج عقیدت کے طور پر اُن کا کلام، اُن کے دوستوں، قدردانوں کے مضامین کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ اس طرح سوز صاحب کا کلام نہ صرف محفوظ ہو کر آئندہ نسلوں تک پہونچے گا، بلکہ اردو کی وسیع تر دنیا تک بھی رسائی ہوگی۔ میرے نزدیک یہ اردو ادب اور ریاست ہریانہ کے ادیبوں کی اہم خدمت ہے۔
میں محسوس کرتی ہوں کہ سبھی اردو دوست اس کا خیر مقدم کریں گے۔

(شریمتی) کرن اگروال

نائب صدر ہریانہ اردو اکادمی

پیش لفظ

کچھ لوگ جب تک زندہ رہتے ہیں، زندگی بڑی بے رحمی سے اُن سے اپنا خراج وصول کرتی رہتی ہے۔ اور جب وہ دُنیا سے اُٹھ جاتے ہیں تو وہی زندگی جس کے سفاک ہاتھوں سے وہ لمحہ لمحہ قتل ہوتے رہے ہیں، جھولیاں بھر کر اُنہیں خراج دیتی ہے۔ یہ حقیقت انسانی زندگی کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ ادب بھی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے اس لیے زندگی ادیبوں پر اکثر نامہربان ہی رہتی ہے۔

سریندر پنڈت سوز بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا ادب کی خدمت کرتا رہا اور جب وہ مرگیا تو ادب نے اس کی خدمت کرنا چاہی۔ اور اس میں تعاون اُن سب دوستوں اور مداحوں کا تھا جو سوز کی خامیوں اور خوبیوں سے قطع نظر صرف اُسے ایک ادیب اور شاعر سمجھ کر پیار کرتے تھے۔ سات ستمبر ۱۹۸۸ء کو سوز کی پہلی برسی کے موقع پر سوز کے دوستوں اور مداحوں نے چاہا کہ ہریانہ اردو اکادمی اس کے کلام کو اِدھر اُدھر سے جمع کرے اور اُسے ترتیب دے کر کتابی صُورت میں شائع کرے۔ ہم نے کوشش کر کے سوز کا کلام اکٹھا کیا۔ جن احباب کے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں اُن سب نے ہماری پوری پوری مدد کی۔ نہ صرف کلام ہی فراہم کرایا بلکہ سوز کے فن اور شخصیت پر مضامین بھی لکھے۔ جو دوست کسی وجہ سے سوز کے بارے میں لکھ نہیں سکے، اُنہوں نے دوسرے طریقوں سے ہماری رہنمائی کی۔

ساحر ہوشیارپوری کا سوز سے کوئی گہرا تعلق نہیں تھا لیکن ہماری درخواست پر ہریانہ کے اس بزرگ شاعر نے سوز کی غزلوں کو ایک نظر دیکھا اور اپنے مشوروں سے بھی نوازا۔ ہریانہ اردو اکادمی ساحر ہوشیارپوری کی شکر گزار ہے۔

مجھے امید ہے کہ سوز مرحوم کے دوستوں اور اردو شعر و ادب سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے حلقے میں اس کتاب کا بجا طور پر خیر مقدم کیا جائے گا۔

کشمیری لال ذاکر

سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی

جناب آزاد گلاٹی

سریندر پنڈت سوز شخص اور شاعر

(ایک تعارف)

سریندر پنڈت سوز ۱۸ر جولائی ۱۹۳۴ء کو منٹگمری (پاکستان) میں پیدا ہوئے اور ۵۳ برس ایک مہینہ اور ۲۰ دن تک زندگی سے جدو جہد کرنے، دوسروں کی راہوں سے کانٹے چننے اور اپنی خود داری کی حفاظت کرتے رہنے کے بعد ۷ر ستمبر ۱۹۸۷ء کو دل کا دورہ پڑنے سے چنڈی گڑھ میں وفات پا گئے۔ انہوں نے اُردو میں آنرز کیا۔ ۱۹۵۲ء میں ٹربیون کی ملازمت انبالہ میں شروع کی اور آخری دم تک اس ادارہ سے وابستہ رہے۔ ان کی انا اور خود اعتمادی نے بہت کم عمر ہی میں انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی ہمت بخشی۔ اس طرح زندگی کی مشکلات سے نبرد آزما رہنے کے حوصلہ نے انہیں جینے کی جو ادا سکھائی، اس نے ان کی شخصیت کو من موہک بنا دیا تھا۔ سوز خوش شکل، خوش لباس اور خوش کلام تھے۔ ان کے کردار میں بلا کی نفاست اور بانکپن تھا۔ وہ دوستی کے سبھی تکلفات بخوبی نبھاتے تھے لیکن صرف چند گہرے دوستوں کی صحبت ہی میں ان کی شخصیت کی گرہیں کھلتی تھیں۔

سوز کو جیوتش، موسیقی اور (SKETCHING) سے بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے انگریزی میں کہانیاں بھی لکھیں، کتابوں پر تبصرے بھی کیے اور مشاعروں کی روداد بھی پیش کرتے رہے۔ انہوں نے ہندی فلموں کے لیے گیت بھی لکھے اور مشاعروں میں اپنے کلام سے سامعین کو متاثر بھی کیا۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ "زخم کوئی ہو" اور ان کی انگریزی کہانیوں کا انتخاب (LOVE WITH-A-DIFFERENCE) ان کی قلندرانہ بے نیازی کی

وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔ ان کی کہانیوں کا بنیادی عنصر انسانی قدروں کا احترام ہے اور ان کے ترجمے بھی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ان کی غزلوں کی زبان کتابی اور اکتسابی نہیں ہے اور نہ ہی ان کے موضوعات روایتی ہیں۔ وہ ایک ہمدردانہ دل کے مالک تھے اور آج کے انسان کی روح پر مشینی زندگی سے لگی خراشوں کو شعروں کا خوبصورت پیکر عطا کرتے تھے۔ الفاظ کے استعمال میں ان کے مزاج کی معصومانہ سادگی جھلکتی ہے۔ غزل میں ان کی یہ سادگی دراصل ان کے عرفانِ زندگی کے حصول اور اسی عرفان کو نہایت سلیقے سے شعروں میں ڈھال دینے کے فن کی عطا ہے۔ سیدھے سادے لفظوں میں زندگی کی گہری سچائیوں اور اس کے عذابوں کو نمایاں کر دینے کا ڈھنگ سوز کو خوب آتا تھا۔ سوز کو زندگی سے بے حد محبت تھی، وہ کہتے ہیں ؎

چہچہاتا رہوں تا عمر اسی آنگن میں
ان دریچوں میں ٹھہرنے کے ٹھکانے دے جا

زندگی سُود خور ہے پھر بھی
قرض جتنا ہے، سب چکائیں گے

اس اعتماد کے ساتھ ساتھ اُنہیں اپنی محرومیوں کا احساس بھی تھا اور کامرانیوں کی تمنّا بھی۔

سمندر میں رہوں، پانی کو ترسوں
وہ مجھ سے کیسے منظر مانگتا ہے

پھول کی ضد میں مجھے چھالے دیئے ہیں عمر بھر
اب تو میرے واسطے شمعیں سُہانی بھیجنا

ان کی روح کی گہرائیوں میں ایک عام سی اداسی کا آسیب ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا ؎

کبھی وہ گھر میں کبھی گھر کے پاس ملتا ہے
وہ شخص مجھ کو تو اکثر اداس ملتا ہے

خون اُبلتا ہے جہاں کھودو زمیں
گھر کہو وہ شخص بنوائے کہاں

زندگی کے آخری کچھ برسوں میں سوزؔ کے شعروں میں موت کے قدموں کی آہٹ صاف سُنائی دینے لگی تھی۔

آنسو پینا، زخم چھپانا، ایسا آساں کھیل نہیں
گم صُم رہ کر جینے والو، تم آخر مر جاؤ گے

لیکن اُنہیں یہ بھی احساس تھا کہ موت اُنہیں فنا نہیں کر سکے گی ؎

کھُل کر برس گیا تو دھنک چھوڑ جاؤنگا
میں آسماں میں اپنی چمک چھوڑ جاؤنگا
میں صندلی لباس ہوں، جلنے کے بعد بھی
سب راستوں پہ اپنی مہک چھوڑ جاؤنگا

سوزؔ نے اپنی وفات سے دو روز قبل جو غزل کہی تھی اس کے دو شعر بھی دیکھئے ؎

غم کے صحراؤں میں شب بھر چیختا رہ جائیگا
اس کی آنکھوں میں فقط اک رتجگا رہ جائیگا
پھر کوئی خنجر اُتارے گا کسی کے پیٹ میں
پھر گلی کے موڑ پر میلا لگا رہ جائیگا

اپنے عہد کے لمحہ لمحہ بدلتے ہوئے مزاج کی ترجمانی اور عکاسی کرنے کا فن انہوں نے سیکھ لیا تھا اور جب وہ انسانیت کی زوال پذیر قدروں، ان سے پیدا ہونے والے کرب اور عذاب زندگی کے سفّاکانہ رویّے اور انسان میں ان سفّاکیوں کے سامنے سینہ سپر ہو جانے کے مرحلوں کا ذکر فنکارانہ چابکدستی سے اپنی غزلوں میں کرنے کا شعور حاصل کر چکے تھے تو موت نے انہیں آدبوچا۔ سوزؔ کی بے وقت رحلت نے اُردو شاعری کی ایک ایسی آواز خاموش کر دی جس نے درد کو جذبہ، اور جذبے کو احساس بنا کر شعر کہنے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ سوزؔ کا شعری اثاثہ کم سہی لیکن یہ اس کے

شاعرانہ شعور کے ارتقائی مراحل کا پتہ دیتے ، عرفانِ زندگی کے نشیب و فراز سے کشاں کشاں گزرتے اور اپنے تجربوں کو تخلیقی عمل سے گزار کر پُراثر شعر کہنے کے فن کا ایک بھرپور تعارف کرانے کے لیے کافی ہے۔

ڈاکٹر ہارون ایوب

سریندر پنڈت سوزؔ کی یادیں

سریندر پنڈت سوزؔ سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی، کس محفل میں ہوئی، یہ تو اب یاد نہیں لیکن پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے مجھے اپنا گرویدہ کرلیا تھا اور مجھے نہ جانے کیوں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں۔ اس کے بعد تو ہر ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے اور اجنبیت کی دیوار گرتی چلی گئی۔ وہی خلوص اور پیار جو پہلی ملاقات میں تھا آخری ملاقات تک قائم رہا ـــــ افسوس صد افسوس کہ وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں ہمارے چاروں طرف اس طرح بکھری ہوئی ہیں کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا ہے کہ وہ ہم سے دُور چلے گئے ہیں ـــــ میں نے جب جب انہیں شعبۂ اُردو میں آنے کی دعوت دی وہ فوراً آئے اور اپنی خوبصورت آواز سے شعری حسن کا ایسا جادو جگایا کہ لوگ واہ واہ، واہ واہ کہتے رہ گئے اور وہ غزل ختم کرکے چلے گئے۔ کئی بار تو طلبہ کے بار بار اسرار پر انہیں دوبارہ پڑھنے کی زحمت دی گئی جسے انہوں نے خوشی خوشی قبول کیا۔

آج اُن ہی محفلوں میں سے ایک محفل کا ٹیپ میرے سامنے ہے اور محترم کشمیری لال ذاکر صاحب کی فرمائش کہ اپنے مرحوم دوست شاعر کے بارے میں اپنے خیالات قلم بند کروں۔ یہ بڑا مشکل کام ہوگیا ہے کیونکہ ٹیپ بجاتا ہوں تو آواز کے ساتھ مرحوم کی شکل سامنے آجاتی ہے اور ان کی باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ قلم رُک جاتا ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔ بہرحال ان بھیگی آنکھوں سے چند یادیں اور تاثرات قلمبند

کر رہا ہوں۔

یوں ہی ہلکی سی دستک دل پہ دے کہ ٹوٹ جانے کا
ہنر آتا تھا اس کو آہٹوں سے جی دُکھانے کا

اس وقت مجھے سریندر پنڈت سوز کی بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک بات کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہوں گا۔ میں نے جب بھی کسی ضرورت سے ان سے فون پر رابطہ قائم کیا ہے انہوں نے میری بات بہت توجہ اور دھیان سے سُنی ہے اور پھر باتوں کا سلسلہ اس انداز سے جاری رکھتے کہ آپ فون بند نہیں کر پاتے اور پھر وہ اپنے دو چار شعر ضرور سُناتے تھے لیکن ان کا انداز کچھ اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ کبھی بارِ خاطر نہ گزرتا۔

چہچہاتا رہوں تا عمر اسی آنگن میں
ان دریچوں میں ٹھہرنے کے ٹھکانے دے جا

افسوس کہ وہ زیادہ دن ہمارے ساتھ نہ ٹھہر سکے لیکن چنڈی گڑھ کے جن ادیبوں اور شاعروں نے مجھے متاثر کیا ہے اور جن کے ساتھ مجھے اُٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے کا موقع ملا ہے، ان میں سریندر پنڈت سوز بھی ہیں جنہوں نے کبھی اپنی برتری اور عمر کے فرق کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ اپنا سمجھا اور وہ بے تکلّف گفتگو کی کہ میں اپنے آپ کو بھول جاتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ ان کے خلوص اور محبّت کا اندازہ صرف آپس کے تعلقات سے نہیں لگانا چاہیئے بلکہ ان کی شاعری سے لگانا چاہیے۔ میرے خیال میں مرحوم دوست نے بہت زیادہ نہیں کہا ہے مگر جو کچھ کہا ہے وہ خوب سے خوب تر کی طرف مائل ہے۔ ابھی تک ان کا سارا کلام غیر مطبوعہ ہے البتہ چند غزلیں مختلف رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

"محبت" ایک چھوٹا سا لفظ ہے جس کی جگر مرادآبادی نے جو تعریف کی ہے وہ کوئی اور نہیں کر سکا ہے ؎

اک لفظ محبّت کا ادنیٰ سا فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

یہی کیفیت سرِیندر پنڈت سوز کی شاعری اور ان کی دوستی اور ان کی ساری زندگی کے شعبوں پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ سب کچھ محبت کی دین ہے۔

اپنی خوشبو میرے سینے میں امانت رکھ دے
آنے والے نہ سہی گزرے زمانے دے جا

سرِیندر پنڈت سوز چنڈی گڑھ کے ان شعراء میں سے ایک ہیں جو اپنے نام کے سہارے نہیں بلکہ اپنے اشعار کی وجہ سے زندہ رہیں گے۔ میں نے اپنے چنڈی گڑھ کے پچھلے دس سالہ قیام کے دوران کبھی ان کی شاعری کا پھیکا دَور نہیں دیکھا۔ محفل خواہ چھوٹی ہو یا بڑی وہ ہمیشہ اس پر چھا گئے ہیں اور حاضرین سے خوب داد حاصل کی ہے کیونکہ انکی آنکھوں نے جو سماجی اونچ نیچ اور طبقاتی کشمکش دیکھی، ان کو ان کی شاعرانہ طبیعت نے شعری سانچے میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جہاں رنگین بیانی، شوخی، محبت کی چاشنی اور حسن پرستی جگہ جگہ ملتی ہے وہیں ان کے کلام میں سماجی شعور اور بیداری کا احساس بھی ملتا ہے جو ہم کو خوابوں کی دنیا سے نکال کر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے واقف کراتا ہے۔

ہے یقیں مجھ کو نہ پھوٹیں گے کسی موسم میں
جانے والے میرے زخموں کو دہانے دے جا

سرِیندر پنڈت سوز نے عورت کے داخلی اور خارجی پیکر کو بھی قریب سے دیکھا اور بڑی خوبصورتی اور برجستگی سے شعری پیکر میں ڈھال کر ایک نئی بات پیدا کی کہ غزل کا حُسن دوبالا ہو گیا۔

تیری آواز کے سائے سے لگا بیٹھا ہوں
کبھی دستک، کبھی خوشبو کے سرہانے دے جا

بچھاؤں میں تو کتنی سلوٹیں آنکھیں دکھاتی ہیں
سلیقہ اس کو آتا تھا نئی چادر بچھانے کا

سریندر پنڈت سوزؔ اُردو زبان و ادب کے دلدادہ تھے۔ ان کو ساری زندگی اُردو سے لگاؤ رہا۔ انھوں نے اُردو زبان کو تازہ اور خوبصورت غزلیں دیں جن پر ہر اُردو والا ناز کرے گا کیونکہ سریندر پنڈت سوزؔ نے جذبات کی مختلف سطحیں اور ذہن کے مختلف گوشوں سے کُرید کُرید کر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اشعار میں سمو کر زندگی کو بے نقاب کیا ہے۔ آپ کی تخلیقات میں ورثہ بھی ہے اور حال کی دھڑکنیں بھی۔

دبا دیا تھا کسی ہاتھ کو اندھیرے میں
وہ مان جائے گا میرا خیال ایسا تھا

جناب راجندر طالب

سریندر پنڈت سوز میری نظر میں

سوز صاحب سے میری پہلی ملاقات آج سے تقریباً بارہ تیرہ برس پہلے ایک مشاعرہ میں ہوئی، ان کے فکر انگیز اشعار دل و دماغ پر ایک گہرا اثر چھوڑ گئے۔ شکل و صورت سے قبول صورت اس شخص میں مجھے انکساری کی کوئی علامت نظر نہ آئی جو میرے نزدیک اچھے شاعر کی ایک پہچان تھی۔ پہلی ملاقات میں مجھے لگا کہ سوز نہایت ہی سنجیدہ قسم کا ایک مغرور شخص ہے جس نے اپنے اردگرد بے جا انا کا ایک جال سا بُن رکھا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش نہ کی، اس واقعہ کے چھ سات سال بعد چنڈی گڑھ میں ہی ادب اور آرٹ کی خدمت میں منہمک ایک ادارہ "کلا درپن" نے پروفیسر آزاد گلاٹی کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا۔ اس بزم میں گلاٹی صاحب کی وساطت سے سوز صاحب سے میرا باقاعدہ تعارف ہوا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھنے لگا۔ جوں جوں میں نے سوز صاحب کو قریب سے دیکھا، مجھے اپنی پہلی رائے پر ندامت ہونے لگی۔ یہ شخص باہر سے جتنا کڑوا اور رُت تھا اندر سے اُتنا ہی میٹھا اور ملائم دکھائی دینے لگا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے کلام کا شیدائی بن گیا۔

سوز کا کلام سُن کر مجھے اکثر لگتا کہ وہ ماضی سے باغی اور حال سے ناخوش ہے۔ میں اسے مستقبل کا شاعر ماننے لگا۔ بعض اوقات اس سے کہتا کہ "سوز بھائی! تمہاری شاعری کو آج سے پچیس تیس سال بعد اور زیادہ پسند کیا جائے گا۔ تم اپنے وقت سے کہیں آگے ہو لیکن یہ بھی میری غلط فہمی تھی۔ اس بات کا احساس مجھے اس عظیم شاعر کی وفات

کے بعد ہوا۔ جب اس کے اشعار کو زبان زدِ خاص و عام پایا اور اس کے شیدائیوں اور پرستاروں کا ایک جمِّ غفیر نظر آیا۔ سوزؔ ایک تجربہ کار سرجن کی طرح اپنے موجودہ معاشرے کی چیر پھاڑ کرنے میں بہت ماہر تھا۔ نئی ترکیبیں، نئی بندشیں، مضمون کا اچھوتا پن۔ نازک خیالی، خوبصورت موضوعات نئی نئی تشبیہات اور استعارے اس کے کلام کے خاص اوصاف تھے۔ جہاں وہ خود بہت سے اوصاف کا مالک تھا وہاں اس کی صاف گوئی کی عادت کو بارہا بددماغی اور تنک مزاجی پر محمول کیا جاتا تھا لیکن دراصل وہ تنک مزاج نہیں تھا نازک مزاج ضرور تھا۔ شاعر نے غالباً سوزؔ جیسے انسان کو ہی مدِّنظر رکھ کر کہا ہوگا۔

احسان ناخدا کا اُٹھاتے میری بَلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دُوں لنگر کو توڑ دُوں

نازک مزاجیاں، مری توڑیں عدو کا دل
مَیں وہ بلا کہ شیشے سے پتھر کو توڑ دُوں

سوزؔ صاحب جہاں شیشے کو پتھر سے توڑنے والی بَلا تھے وہاں طرح طرح کی بلاؤں نے بھی زندگی بھر ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جہاں ان کے پرستار قدم قدم پر ان کی بلائیں لیتے تھے۔ وہاں قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ہر قدم پر ان کو ایک نئی بَلا کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا لیکن شاید اپنی بَلا نوشی کی وجہ سے وہ ان سے نبرد آزما ہونے میں زیادہ مشکل محسوس نہیں کرتے تھے۔

شراب نوشی کے بعد سگریٹ نوشی ان کا ایک مرغوب مشغلہ تھا۔ میں نے انہیں کبھی سگریٹ کے بغیر نہیں دیکھا۔ دیا سلائی خریدنے میں اکثر کنجوسی کرتے تھے اور ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ سلگایا کرتے تھے۔ جب بھی میرے پاس آتے دو سگریٹ اکٹھے سُلگاتے ان میں سے ایک مجھے دے کر کہتے: "حضور! ایک کنواری غزل لایا ہوں جس کو کہنے کے بعد میں نے خود بھی نہیں پڑھا اور نہ ہی کسی اور کو سُنایا ہے۔ آپ پہلے سامع ہیں"۔ میں اپنے کچھ اور سخن فہم دوستوں کو فوراً اکٹھا کر لیتا اور ہم سب ہمہ تن گوش ہو کر ان کا کلام سُنتے اور سر دُھنتے۔

ایک بار جلدی میں آئے اور کہنے لگے : " میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ یہ تین شعر کل رات ہی ہوئے ہیں سوچا بوجھ اُتار جاؤں، تمہارے پاس چلا آیا۔"

لیجئے وہ شعر میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں آپ بھی سُنئے ؎

دکھائی دیتا نہیں روشنی سے ڈرتا ہوں
کہاں گئیں میری آنکھیں تلاش کرتا ہوں

وہ ابر ہُوں کہ جسے آندھیوں نے پالا ہے
ہوائیں خاک کی خوشبو نہ ہو تو مرتا ہُوں

مَیں آرزو ہُوں اگر کوئی مجھ کو اپنا لے
مَیں رنگ ہُوں کسی تصویر پر نکھرتا ہُوں

شعر سُنانے کے بعد وہ تو اپنی سگریٹ کی ڈبیہ اُٹھائے چل دیئے لیکن ہم دیر تک کیف و سرور میں سرمست سر دُھنتے رہے۔

میں نے کبھی ان کو شعر سُنانے کے لیے کوئی بیاض کھولتے نہیں دیکھا۔ جیب سے کچھ پرچیاں نکالتے اور ان پر شکستہ حروف میں لکھے کچھ اشعار سُنا دیا کرتے، کئی بار شعر سگریٹ کی ڈبیہ پر بھی لکھے ہوتے۔ یہاں تک کہ کسی مشاعرہ میں بھی وہ کسی بیاض یا نوٹ بک کا سہارا نہیں لیتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ کاغذ پر ایک دو غزلیں جو انہیں مشاعرہ میں پڑھنا ہوتیں، لکھ کر لے جاتے، کئی بار ایسا ہوتا کہ وہ کسی بزم میں زبانی کلام سناتے سناتے شعر بھُول جاتے۔ اس وقت ان کے قریبی دوست انہیں بھُولا ہوا شعر یاد کرانے میں مدد کرتے۔ ان کا ایک عزیز دوست راجندر چاند اکثر وقت پر اُن کے کام آتا۔ بارہا جیب سے کاغذ کی پرچیاں نکالتے وقت کہا کرتے " قبلہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی کو میری لاش جلانے کے لیے لکڑیوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ کام ان پرچیوں سے بخوبی ہو جائے گا۔" ان کی ایسی باتوں سے ہم رنجیدہ ہوتے تو کہتے کہ بھئی مرنا تو ایک دن سب کو ہے پھر موت کے ذکر سے اس قدر دُکھی کیوں ہوتے ہو! ایک دن آئے اور ایک غزل سُنائی جس کے چند اشعار یاد رہ گئے ہیں، سنئے ؎

پربتوں کی کوکھ سے اُجلی نشانی بھیجنا
ہو سکے تو اس برس جھرنوں کا پانی بھیجنا

پھول کی ضد نے مجھے چھالے دیئے ہیں عمر بھر
اب تو میرے واسطے شمعیں سُہانی بھیجنا

سرخرُو ہیں دوستوں اور دشمنوں سے آج ہم
تم سے ممکن ہو تو مرگِ ناگہانی بھیجنا

آخری شعر سُن کر میرا دل کانپ گیا۔ میں نے عرض کیا: "سوز صاحب! آپ ہر وقت یہ منحوس باتیں کیوں کرتے ہیں"۔ کہنے لگے:- "شعر کیسا ہے یہ بتاؤ، اس میں کیا کہا ہے، اس پر مت جاؤ۔"

لیکن کسے خبر تھی کہ ان کی یہ خواہش قبول ہو جائے گی اور وہ سچ مچ مرگِ ناگہانی کا ہی شکار ہوں گے۔

سوز صاحب اُردو شاعری کے علاوہ انگریزی میں کہانیاں بھی لکھا کرتے۔ روزنامہ ٹربیون میں ان کی انگریزی کہانیاں اکثر چھپتی رہتی تھیں۔ وہ اسی روزنامہ سے منسلک بھی تھے۔ وہ اس اخبار کے لیے ادبی پروگراموں کی رپورٹنگ بھی کرتے، انہوں نے اپنا کلام کبھی سنبھال کر نہیں رکھا۔ نہایت ہی لا پرواہ قسم کے انسان تھے، اسی عادت کی وجہ سے وہ اپنے کلام کو کتابی شکل نہیں دے سکے۔

ہندو پاک کے ادبی جریدوں میں ان کا کلام اکثر چھپتا رہتا۔ انہوں نے فلموں کے لیے گیتوں کے کئی دلکش مکھڑے بھی لکھے اور کئی مجرے بھی قلم بند کیے۔ فلمی دنیا کے ستون بسو بھٹا چاریہ سے ان کے قریبی مراسم تھے اور ایک فلم کے گانوں کے لیے بات چیت بھی چل رہی تھی لیکن افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور یہ ہونہار اور ذہین شاعر بہت جلد ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا۔

سوز صاحب کے انتقال سے کچھ دن پہلے میری ان سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت میں نے انہیں بتایا کہ اس سے اگلے ہی دن مجھے ایک آپریشن کے لیے پی۔جی۔آئی

(چنڈی گڑھ کا اسپتال) میں داخل ہونا ہے۔ وہ کہنے لگے "اچھا تم جلد تندرست ہوکر آؤ، پھر تمہارے غسلِ صحت کا اہتمام کریں گے۔ اس دوران انہوں نے ہسپتال میں میری مزاج پُرسی کے لیے آنے کا وعدہ بھی کیا لیکن کسے معلوم تھا کہ بات کا یہ دھنی شخص وعدہ خلافی کرکے میری مزاج پرسی کو تو کیا آئے گا بلکہ مجھے کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ کر خود کہیں دُور جا بسے گا اور میں (بوجہ طویل علالت) ماتم پُرسی کے لیے بھی اس کے گھر نہیں جا سکوں گا۔ ۳۱ر اگست ۱۹۸۷ء کو میرا آپریشن ہوا اور ۷ر ستمبر کو سوز صاحب راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ مجھے ایک دوست نے ہسپتال میں اس صدمہِ جانکاہ کی خبر دی تو چند اشعار فی البدلیہ میری زبان پر آ گئے، ان میں سے جو یاد رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں ؎

جا رہا ہے آج گلشن سے وہ اے میرے حبیب
آنِ گلشن، شانِ گلشن، جانِ گلشن، عندلیب
خود سراپا سوز اوروں کے لیے باغ و بہار
جا رہا ہے ہم کو چھوڑے آج وہ یاروں کا یار
بذلہ سنج، وہ نغمہ سنج، جادو رقم، جادو بیاں
مہر و اُلفت وہ مجسّم، شاعروں کا قدر داں
کب ملے گا ایسا مخلص اور پھر غم خوار دوست
ملنے کو ملتے رہیں گے یوں تو بے شک یار دوست

پچھلے سال ۷ر ستمبر کو ہریانہ اُردو اکادمی نے سوز صاحب کی پہلی برسی پر ایک جلسہ منعقد کیا تھا۔ میں نے اس موقع پر سوز صاحب کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی تھی، ملاحظہ فرمائیے ؎

تُو سراپا سوز تھا پُرسوز تھا تیرا کلام
شعر تیرا مستند، تُو شاعرِ عالی مقام
کل تلک آداب کہتے تھے جو تجھ کو پیار سے
آج اُن لوگوں کی جانب سے تجھے لاکھوں سلام

استعارے اور تشبیہات تیری بے مثال
کچھ نئے انداز سے کہنے میں تھا حاصل کمال
شعر بھی نازک مزاجِ پارسا تیرا تھا سوزؔ
اور تُو خود بھی مزاجِ پارسا نازک خیال

جو کچھ بھی ہے دل میں تمہارے کیا سب کچھ کہہ پاؤ گے
سوزؔ کا غم جاں سوز بہت ہے کیا اس کو سہہ پاؤ گے
سوزؔ کے اس مصرعے سے بڑھ کر اور تخیّل کیا ہوگا
وصل کے ہار پرونے والو، تم تنہا رہ جاؤ گے

سوزؔ جہاں ایک پُرگو شاعر تھا وہاں اس کا کلام بھی پُر اثر تھا، اس کی یاد آسانی سے بھلائی نہیں جا سکتی۔ اس خطّے کی اُردو شاعری میں اس کے اچانک اُٹھ جانے سے جو خلاء پیدا ہو گیا ہے وہ آسانی سے پُر نہیں کیا جا سکتا؟ ع

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

جناب آر، ڈی، شرما تاؔثیر

سوؔز کی شاعری کا مختصر جائزہ

قبلہ ساؔحر سیال کوٹی صاحب کا ایک شعر ہے ؎

ترے خط کو ملاقاتِ مکمل کیوں نہ میں سمجھوں
تیری تحریر میں بھی لذّتِ تقریر ہوتی ہے

ہاں صاحب یہ ایک حقیقت کا انکشاف ہے، محبوب کی تحریر میں لذّتِ تقریر ہوتی ہے آیئے ہم اپنے محبوب شاعر جناب سوؔز صاحب کی تحریر دیکھیں اور ان کی لذتِ تقریر سے مستفیض ہونے کی سعادت حاصل کریں۔

سوؔز کو بناوٹ و تصنع سے نفرت تھی ریاکاری سے چڑ تھی، بہروپیوں سے وہ دُور بھاگنا چاہتے تھے، شہر کی زندگی میں جو ایک بناوٹ ہے ایک تکلّف ہے، سچائی و ایمانداری کا فقدان ہے وہ انہیں بہت اکھرتا ہے اور بار ہا اس کا اظہار کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں یہ اشعار ؎

فاصلے رکھ کر کبھی یوں درمیاں ملتا نہ تھا
شہر کے لوگوں سے تب اس کا کوئی رشتہ نہ تھا

یا اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں ؎

زردیوں کے شہر میں اُکتا گئی ہے زندگی
اب کے ہم کو پھول کوئی آسمانی بھیجنا

لیکن شاعر کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس ماحول سے فرار کا راستہ اختیار نہیں کرسکتا اسے

یہیں رہنا ہے اسی بناوٹی زندگی سے نباہ کرنا ہے جیسے تیسے اور اس کی قیمت بھی ادا کرنی ہے، بہت بڑی قیمت سوؔز صاحب کی حالت میں تو ان کا یہ شعر ایک منحوس پیشین گوئی ثابت ہوا۔

آنسو پینا زخم چھپانا ایسا آساں کھیل نہیں
گُم صُم رہ کر جینے والو تم آخر مر جاؤ گے

اقدار و رشتوں کی شکست و ریخت میں حسّاس انسان کو قرار کہاں ؟ تمام اعلےٰ اقدار رُو بہ زوال نظر آتی ہیں۔ تمام قریبی رشتے محض رسمی باتیں اس حالت میں محسوس کرنے والے دل پر کیا بیتتی ہے وہ سوؔز صاحب کے اس شعر میں دیکھیے ؎

یُوں تو کہنے کو مجھے شہر کا گھر گھر جانے
میرا اپنا ہی مجھے آنکھ کا کنکر جانے

اور اس کا ردِّ عمل یہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے آپ میں سمٹ جاتا ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے

کھویا کھویا تنہا تنہا چپ سی سادھے رہتا ہے
ایک زمانہ بیت گیا ہے سوؔز سے اپنی بات ہوئے

اور اس المیے کا یہ پہلو کتنا کرب ناک ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو پُکار پُکار کر کہہ رہا ہے ؎

مِرا خلوص جو دیکھو تو دشمنی سمجھو لو
کہوگے سوز سا یارو کہیں ملا ہی نہیں

جن معدود چند لوگوں کو سوز سے ملنے (حقیقت میں ملنے کا) موقع ملا ہے وہ اس شعر کے حرف حرف کی صداقت کی گواہی دیں گے۔

اور پھر رشتوں کے بارے میں تو اس شخص کا اعتقاد ہی کچھ اور ہے ؎

پچھلے جنموں کے عہد ہیں پیارے
کون ورنہ کسی سے ملتا ہے

یہ شخص جو کسی سے ملنے کو پچھلے جنموں کا عہد مان رہا ہے وہ آج کی محض رسمی باتوں، چکنی چپڑی تصنّع سے پُر باتوں کو سُن کر تڑپ ہی تو اُٹھتا ہوگا، میرا ایک شعر ہے ؎

اپنے مطلب کے لیے ہی آپ کو اپنا کہیے
اس زمانے میں اسے ہی دوستی کہہ لیجئے

ہم آپ سب جانتے ہیں کہ آج کل ایسی دوستی عام ہے، یہ وہ زمانہ ہے کہ نہ خود سیدھی راہ پر چلتا ہے نہ دوسرے کو چلنے دیتا ہے۔ اب وہ شخص کہاں جائے جس نے ٹیڑھی راہ چلنا سیکھا ہی نہ ہو جسے یہ ہنر آتا ہی نہ ہو ؎

میں سوا سچ کے کوئی بات نہ سوچوں گا کبھی
عہد یہ کب وہ بھلا مجھ کو نبھانے دے گا

اس لیے شاعر ایک گھٹن سی محسوس کرتا ہے بے بسی کی، بے یقینی کی اور انجام یہی ہو سکتا ہے جس کا اظہار اس شعر میں ہے ؎

اب تو جلتا ہے وہ نہ بجھتا ہے
بے حسی کا دھواں سا لگتا ہے

اس کے بعد ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے یعنی ؎

نیشِ غمِ حیات گوارہ کریں گے ہم
یوں اضطرابِ شوق کا چارہ کریں گے ہم

اور مجبور ہو کر ادیب خود فریبی میں پناہ ڈھونڈتا ہے، جانتا ہے کہ وہ فریب کھا رہا ہے لیکن کبھی کبھی فریب کھانے میں بھی ایک لطف ہوتا ہے، ایک راستہ تو ہے شاید ایک یہی راستہ سمجھوتے کا راستہ ؎

اپنی ویرانیٔ دل دیکھ کے جی چاہتا ہے
تیری باتوں تیری نظروں پہ بھروسہ کر لوں

پھر کبھی کبھی جب اضطراب حد سے بڑھ جاتا ہے بے وفا دوستوں کی یاد آتی ہے، ان کے دھوکے پر غم و غصہ کا اظہار لازم ہو جاتا ہے تو لا محالہ شدید تلخی سے مملو الفاظ بھی شعر کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں ؎

غم کے ناگوں سے کہو اب تو انہیں بھی ڈس لیں
جو شرابوں میں ہمیں زہر دیا کرتے تھے

بے شک بہت تلخ بات کہی ہے لیکن کیا ایسے ہی دوستوں نے اعلیٰ ترین ذہنوں' کچھ بے مثل ادبا، کچھ اُبھرتے ہوئے فنکاروں کو اسی زہر سے مار نہیں ڈالا ؟ -

لیکن اس سب کے باوجود وہ شاعر وہ ادیب کیا جو وقت کے نامساعدات سے ہار مان کر ہتھیار ڈال دے لہٰذا سوزؔ صاحب کہتے ہیں ؎

اُلجھے ہوئے ہیں وقت کی مَوجِ بلا سے ہم
اک کشمکش ضرور مگر بال و پَر میں ہے

اس کے علاوہ یہ کیا کم ہے کہ شاعر نے اتنی بے باکی سے اتنے خلوص سے اتنے فنکارانہ انداز میں معاشرے کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کر دیا۔ اپنے عہد کی یہ سچی عکاسی ہی سچّی شاعری کی پہچان ہے۔ سوزؔ صاحب کی شاعری اور شخصیت میں کوئی فاصلہ نہیں کوئی تضاد نہیں فن اور فنکار کا ایک ہو جانا بقول ہرڈن کمار ورتا ایک معجزے سے کم نہیں، سریندر پنڈت سوزؔ صاحب کی شاعری میں یہ معجزہ ہمیں صاف نظر آتا ہے شاعری شاعر کے عمیق ترین جذبات و محسوسات کا فنکارانہ اظہار ہے اس کے دل کی دھڑکن سُنائی دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں تمام معاشرے، اس کے افراد کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی ہوتی ہے، مجھے یقین ہے کہ اس مختصر سے تجزیے میں آپ نے خود اپنے دل کی آواز بھی ضرور سُنی ہوگی، اس افسانے کی حقیقت کے آپ ضرور قائل ہونگے۔

سریندر پنڈت سوز بطورِ انسان اور بطورِ فنکار بے حد پیارے تھے۔ ایسے انسان جن کے بارے میں دل یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں ان سے ہمارا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکا ہے۔ اس تاثر کا کارن بھی سوزؔ صاحب خود اس شعر میں افشا کرتے ہیں ؎

کھُل کر برس گیا تو دھنک چھوڑ جاؤں گا
میں آسماں میں اپنی چمک چھوڑ جاؤں گا

رشتوں کا تعلق اگر روح سے ہے تو وہ لافانی ہے اس لیے سوزؔ صاحب سے ہمارا رشتہ بھی قائم و دائم ہے!

جناب راجندر چاند

سوزؔ کی قربتیں

اس آدمی کے بارے میں کہنا یا لکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے جس کے آپ بہت ہی قریب رہے ہوں۔ حالانکہ لکھنا میرے لیے مشکل کام نہیں ہے کیونکہ میں تب سے لکھتا چلا آرہا ہوں جب میں اسکول میں پڑھتا تھا لیکن "پنڈت جی" یعنی سریندر پنڈت سوزؔ کے بارے میں لکھنا اپنی نسوں پر بلیڈ چلانے جیسا کام ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اپنی نسوں پر بلیڈ کس طرف سے چلانا شروع کروں......؟

میں نے سوزؔ کو سب سے پہلے ۱۹۶۳ء میں انبالہ چھاؤنی کے ڈیفنس ایریا (DEFENCE AREA) میں منعقدہ ایک مشاعرے کے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ اسٹیج پر جو دوسرے شاعر موجود تھے ان میں جوشؔ ملیح آبادی، علی سردار جعفری بیکلؔ اُتساہی اور کنور مہندر سنگھ بیدی بھی شامل تھے۔ پنڈت جی کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا اور پھر اس کے بعد ٹریبون (TRIBUNE) آفس میں ان سے ملنے گیا جہاں کچھ ہی عرصہ پہلے خود میں نے بھی نوکری شروع کی تھی۔ ان سے ایک بار ملنے پر بار بار ملنے کو جی چاہا اور پھر باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان میں ایسا کچھ تھا کہ ملنے والے پر غضب کا اثر ہوتا تھا۔ ان کی جادوئی شخصیت کی وجہ سے بہت سے لوگ ان کی زندگی میں آئے۔ بولتے خوب تھے، خوبصورت باتیں کرتے تھے، ان کے کردار کی خوبی یا خامی یہ تھی کہ جہاں کچھ لوگوں کو وہ خوب پسند کرتے تھے وہیں کچھ لوگوں کو سخت ناپسند بھی۔ کسی بھی وجہ سے کسی کے ساتھ رسمی تعلقات زیادہ دیر تک بناتے رکھنا

ان کے لیے ممکن نہیں ہو پایا۔

انہوں نے اپنے مزاج کی سادگی کی ہی وجہ سے بہت سے ان لوگوں کی مدد کی جو شاید ان کی مدد کے حق دار نہیں تھے۔ کبھی ان کی مدد روپے پیسے کی شکل میں رہی تو کبھی کچھ لکھنے والوں کے کلام کو درست کرنے کی شکل میں۔ دوستوں کی محفل جماتے ہوئے ان کی شاموں کو رنگین بنانے کا ذمّہ انہوں نے اپنے ہی سر اکثر لیا۔ طبیعت کے فقیر تھے مگر خوب خرچ کرنے کی عادت تھی۔ اچھے قلم رکھنے کے شوقین تھے، خوبصورت شعر کہتے تھے اور بہت جلدی لکھ لیتے تھے۔ کبھی کبھی تو رکشا یا بس میں ان کے ساتھ جاتے جاتے میں نے دیکھا ہے کہ مکمل غزل ہو جاتی تھی۔

جیسا کہ ہر تخلیق کار کے ساتھ ہوتا آیا ہے، زندگی میں انہیں بھی فرسٹریشن (FRUSTRATION) کا کافی سامنا رہا۔ نوکری میں چڑھاؤ اور اُتار کا دَور انہوں نے دیکھا۔ میں نے ہر دَور میں حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے انہیں دیکھا۔ اپنی پریشانی کو بھول کر دوسروں کی پریشانیاں دُور کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اپنی پریشانی چھپانی ہو تو ہنسنے ہنسانے کی باتیں زیادہ کرتے تھے، جتنے اونچے شاعر تھے اتنا اونچا مقام انہیں حاصل نہیں ہو سکا، اس کی وجہ شاید یہ رہی کہ اس معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتہ انہوں نے نہیں کیا۔ خودداری ہمیشہ قائم رکھی۔ ان کے جیتے جی ان کا کلام کتاب کی شکل میں نہیں چھپ سکا۔ انہوں نے انگریزی میں کچھ کہانیاں بھی لکھی تھیں جن کو (LOVE WITH-A-DIFFERENCE) کے عنوان سے چھاپنے کا وعدہ دلّی کے ایک پبلشر نے کیا تھا مگر وہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوا۔

اپنی تکلیف کا راز دار پوری طرح سے انہوں نے کسی کو نہیں بنایا۔ ان کے اندر ایک ایسا خلا تھا جس کی مکمل جانکاری ان کے قریب سے قریب تر کسی بھی شخص کو نہیں ہو پائی۔ اُن جیسے خوبصورت انسان کی موت بھی کتنی عجیب ہوئی۔ باتھ روم میں دل کا دَورہ پڑا تو وہیں گر پڑے جس سے باتھ رُوم کا دروازہ بند ہو گیا۔ دروازہ توڑ کر جب اُنہیں باہر نکالا گیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

جناب ترنم آہوجہ

یادیں سریندر پنڈت سوزؔ کی

جناب سریندر پنڈت سوزؔ ایسے شاعر تھے جنہوں نے کبھی عشق کی بنیادی سچائی اور انتہا کو بے شک چھوا بھی نہ ہو اور ماحول کے افسوس ناک منظر کو چھوڑا بھی نہ ہو جس کی مثال اُنکے ان اشعار سے ملتی ہے ؂

میں زیست میں ہر آن ترے ساتھ رہا ہوں
رسماً ہی بتا دے کہ تجھے کیسا لگا ہوں

عداوتوں کا جنوں ہے تو ساتھ ساتھ ہیں ہم
محبّتوں کے سفر میں بچھڑ بھی سکتے ہیں

اب مجھے یاد بھی نہیں آتی
وہ مری چشمِ تر میں رہتا ہے

سوزؔ صاحب سے میری ملاقات فروری ۱۹۷۹ء میں مرحوم شاعر جناب پریمؔ وار برٹنی صاحب کے درِ دولت پر ہوئی، جن دنوں پریمؔ صاحب سخت بیمار تھے، اسی روز راجندر چاندؔ سے بھی بندہ کی پہلی ملاقات تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مقامی ادارہ "کلا درپن" آنے والے ماہ اپریل میں پریمؔ وار برٹنی کے جشن منانے میں مصروف تھا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۷۹ء کو "کلا درپن" کی طرف سے پریمؔ صاحب کا جشن جس شان و شوکت کے ساتھ ٹیگور تھیٹر

میں منایا گیا اس کی مثال چنڈی گڑھ میں نہیں ملتی۔ اسی روز سوز صاحب، ستیہ نند شاکر، راجندر ناتھ رہبر پٹھانکوٹی وغیرہ کے ساتھ تقریباً ۲ گھنٹہ کی ملاقات نے پنڈت جی کے بہت نزدیک کر دیا۔ جشن کے مشاعرہ کے بعد جب میں نے پنڈت جی سے کچھ اور اشعار سُنانے کی خواہش ظاہر کی تو فرمانے لگے: "سُنو گے! تو سُنو۔

ہجر کے صحراؤں کو کب تک یادوں سے مہکاؤ گے
وصل کے ہار پرونے والو تم تنہا رہ جاؤ گے

زردیوں کے شہر میں اُکتا گئی ہے زندگی
اب کے ہم کو پھول کوئی آسمانی بھیجنا
پھول کی ضد نے مجھے چھالے دیئے ہیں عمر بھر
اب تو میرے واسطے شمعیں سُہانی بھیجنا

ان کے کردار کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ آپ ہر وقت احباب کی ہر طرح کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے کیونکہ وہ دل سے محسوس کرتے تھے کہ دوستوں کا حال سننے سے دوستوں کے دل کا بوجھ یقیناً ہلکا ہو جاتا ہے۔ ہر ضرورت مند کی ہر طرح کی مدد کرنا ان کی زندگی کا شیوہ تھا۔

ایک شام وعدہ کر کے میں کسی مجبوری کی وجہ سے جب انہیں مل نہ سکا تو اگلی صبح ان کا فون آیا تو فرمانے لگے: "کہ میں آپ کو اپنا سمجھتا ہوں اور اگر اپنے عزیز اس طرح کریں تو اچھی بات نہیں"، "بس میں تو یہی سمجھنا چاہتا ہوں جو اپنے ہیں ساتھ رہیں جن کو ساتھ چھوڑنا ہے چھوڑ جائیں۔ میں نے جواب میں جب نہ آنے کی وجہ بتائی تو فرمایا:۔ "چھوڑو، میں تو مذاق کر رہا تھا" یہیں ان کے دوستوں اور عزیزوں کے لیے محبّت کی مثال ملتی ہے۔

سوز صاحب کی پیدائش ۱۸ جولائی ۱۹۳۴ء میں منٹگمری (پاکستان) میں ہوئی۔ بچپن سے ہی اُردو شاعری سے پیار تھا۔ سنگیت، فوٹو گرافی اور پینٹنگ کے شوق کے علاوہ جیوتش سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ شروع میں وہ سوز ساہیوالی کے نام سے جانے

جاتے تھے جس نام سے انہوں نے کچھ فلموں کے گیت بھی لکھے۔

۱۹۵۲ء میں انبالہ سے شائع ہونے والے انگریزی ٹربیون سے وابستہ ہوتے غربت کا احساس اور لوگوں کی تکلیفوں کو بانٹنا اُن کا کردار اسی طرح رہا۔

زندگی سود خور ہے پھر بھی
قرض جتنا ہے سب چکائیں گے

ان کی فراخدلی کے چند واقعات ملاحظہ فرمائیں:۔

چنڈی گڑھ کے ۱۷ اسیکٹر کے ایک دفتر میں ایک بے روزگار بزرگ لوگوں کو گرمیوں میں پانی پلایا کرتا تھا۔ اپنی مرضی کے مطابق اگر اُسے کوئی پانچ دس روپے دے دیتا تو قبول کر لیتا۔ اتفاق سے ایک روز جب سوز بھائی بھی وہاں پانی پی رہے تھے تو پتہ چلا کہ اس غریب کی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے اور دفتر والے اس کی امداد کے لیے کچھ رقم جمع کر رہے تھے۔ سوز صاحب نے کہا کہ میں کل ملوں گا۔ اگلے روز جب پہنچے تو اس غریب کے ہاتھ نئی خریدی ہوئی "لیڈی رسٹ واچ تھما کے فرمایا کہ "بٹیا کے لیے میری طرف سے قبول فرمائیں۔"

غریب خانہ پر شاکر صاحب اور راجندر چاند وغیرہ کے ساتھ اکثر تشریف لاتے تھے ایک شام آئے تو فرمایا:۔" ارے بھوک لگی ہے، کیا کھلاؤ گے"۔ میری اہلیہ نے عرض کیا:۔" پنڈت جی آملیٹ کے ساتھ ڈبل روٹی؟" کہنے لگے مرچ کم ہو اور ذرا جلدی، جانے سے پیشتر فرمایا کہ بہو کو باہر لاؤ۔ وہ آئی تو کچھ روپے اس کے ہاتھ میں تھما کر کہا:" عزیزہ یہ شگن ہے، قبول کرو۔" وہ انکار نہ کر سکی۔ ایک شام پھر تشریف لائے تو چائے کے ساتھ بھنا ہوا گوشت شوق فرمانے کے بعد بے حد خوش ہوئے۔ اسی شام بے تکلف اور غیر رسمی شعری نشست کم از کم دو گھنٹے رہی۔ رخصت ہونے سے قبل کہنے لگے:" اپنی بہو کو شگن دینا ہے۔" میں نے عرض کیا کہ شگن تو حضور پہلے ہی دے چکے ہیں، تو جھنجلا کر کہا:۔" میری بہو ہے، بیچ میں بولنے کا اختیار آپ کو کس نے دیا ہے؟" خلوص درمیان تھا، مجھے خاموش رہنا پڑا۔ اسی شام راجندر چاند اور میرے دیرینہ شاعر دوست

جناب بیشپال زخمی بھی موجود تھے۔

پنڈت جی جب بھی دوستوں میں ہوتے تو کہتے کہ کوئی نیا شعر سُناؤ، جب میں کہتا کہ پہلے آپ فرمائیں تو اپنی مختلف جیبوں سے چھوٹے چھوٹے کاغذ کے نئے پُرانے پُرزے نکال کر اپنا کلام سُناتے یہاں تک کہ کئی بار سگریٹ اور دیا سلائی کی ڈبی پر بھی شعر ہوتے تھے۔ سوز صاحب نے اپنی مختصر سی زندگی میں زائد از ایک سو پچاس مشاعروں میں شرکت کر کے داد حاصل کی۔

پنڈت جی اُردو کے علاوہ انگریزی کے بھی اچھے ادیب تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے معیاری رسائل میں اپنی انگریزی کہانیاں اور مضامین لکھنے کے علاوہ امریکہ کے بھی ایک پرچے میں اپنی جان پہچان کروائی۔ انگریزی کہانیوں کی ایک کتاب LOVE WITH-A-DIFFERENCE "لَو وِد اے ڈفرینس" کو بھی ترتیب دیا۔ ان کی چند انگریزی کہانیاں تیلگو، اُڑیہ، تامل، ہندی اور اُردو میں بھی ترجمہ ہو کر بے حد مقبول ہوئیں۔

ملاقاتیں مسلسل ہوتی رہیں۔ شعر و شاعری کے دَور چلتے رہے۔ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۸۷ء بروز جمعہ طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے میں دفتر سے چھٹی پر تھا اور میری عدم موجودگی میں ان کا فون آیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ۶ ستمبر ۱۹۸۷ء بروز اتوار رات کو مَیں نے زخمی صاحب سے فون پر بات کی تو معلوم ہوا کہ وہ اسی وقت سوز صاحب سے مل کر آئے ہیں اور اطلاع دی کہ آئندہ ایک دو روز میں کسی شام چند شاعر دوست آپ کے ہاں تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہیں، تیاری رکھنا، مگر صد افسوس کہ وہ شام کبھی نہ آسکی۔

وقت بہت ظالم ہے۔ اگلی صبح ۷ ستمبر جب میری اہلیہ چائے تیار کر رہی تھیں تو میں انگریزی ٹربیون حسبِ معمول پڑھ رہا تھا۔ میں نے آواز دی کہ چائے چھوڑو اور ایک دردناک خبر سُنو کہ ہمارے سوز صاحب نہیں رہے۔ جب انہوں نے ٹربیون کے صفحہ ۳ کے پہلے کالم پر نظر ڈالی تو کہا کہ یہ کوئی اور سوز صاحب ہوں گے۔" مگر مَیں جانتا تھا

کہ یہ سوزؔ اور کوئی نہیں ہو سکتا، کاش اس روز اخبار فروش نے ناغہ کیا ہوتا۔
شاید سوزؔ صاحب کو آگہی تھی کہ وہ جہانِ فانی سے رخصت ہونے والے ہیں اور اسی لیے اس طرح کی شاعری کر رہے تھے ؎

زندگی ذہن کی اسیر رہی
تھوک میں خون کی لکیر رہی

بڑ کا قدیم پیڑ تھا لیکن مرا نصیب
جب شہر بس گیا تو اُجڑنا پڑا مجھے

میں خودکشی کے دریچوں سے لوٹ آیا ہوں
یہ سلسلہ میری سانسوں کا ٹوٹتا ہی نہیں

آخر میں اپنے ایک شعر کے ساتھ اس مہک بھرے چہرے والے حسین دوست اور شاعر مرحوم سریندر پنڈت سوزؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں ؎

توسوز تھا دنیا کا طلبگار نہیں تھا
دنیا یہ مگر تیری طلبگار رہے گی

جناب ایچ کے لال

نرم گفتار سوزؔ

جب تک ادراک مکمل طور پر تعاون نہ کرے تو ایسے مشکل مراحل طے کرنا جاں کنی سے کم نہیں۔ ایک ایسے دوست کے بارے میں اظہارِ خیال جو آج ہمارے درمیان نہیں! نرم گفتار مگر تیز رفتار، خوبصورت، نوجوان، مرنجاں مرنج، خمدار گیسوؤں والے سریندر پنڈت سوزؔ سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۶۷ء میں ہوئی جن دنوں ٹربیون کا دفتر انبالہ میں تھا۔ نایاب نسل کا کُتا ہمراہ لیے خوبصورت پوشاک زیب تن کیے، جیب میں آویزاں قیمتی قلم اور ایک ہاتھ میں کوئی نئی کتاب لیے وہ اکثر ۱۰۰ دی مال روڈ انبالہ چھاؤنی میں مجھے ملتا۔ اس کے نزدیکی رشتہ دار مگر میرے قریبی دوست صحافی معلّم اور ڈاکٹر چندر ترکھاؔ ان دنوں جالندھر اور انبالہ سے بیک وقت شائع ہونے والے روزانہ "ویر پرتاپ" کے مدیرِ انتظامیہ تھے۔ میں اکثر ہر ہفتہ ان سے ملنے انبالہ چلا جاتا تھا۔ اُن دنوں سریندر پنڈت سوزؔ کی انگریزی کہانیاں خاص طور پر کتوں کے عادات و خصائل کے بارے میں ٹربیون میں شائع ہوتی تھیں جنہوں نے مجھے خوب متاثر کیا۔ ایک جملہ اُس کی زبان پر اکثر ہوتا تھا کہ "ابھی ذرا جلدی میں ہوں، پھر کبھی فرصت سے بیٹھیں گے" اور چلتے چلتے ایک دو شعر سنا جاتا۔

ٹربیون کا دفتر چنڈی گڑھ آگیا۔ ملاقاتیں اکثر ہونے لگیں۔ ضدّی بہت تھا۔ ایک مقامی مشاعرے میں سامعین میں سے کسی ایک نے کہا کہ مائیک سے ذرا پیچھے ہٹ جائیے، آپ کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی۔ اپنا کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ آپ مائیک کو

پیچھے ہٹا دیجیے، میں اپنی جگہ سے ہٹنے والا نہیں۔ سگریٹ اور شراب نوشی اس کے حسین مشغلے تھے۔ اس کے علاوہ گپ مارنا جسے جھوٹ بولنا نہیں کہا جا سکتا اس کا شوق تھا ملازمت کے سلسلہ میں اسے چند ماہ کے لیے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ واپس آکر اس نے بڑی دلچسپ باتیں بتائیں یعنی زیادہ وقت ساحر لدھیانوی کے ساتھ گزرتا تھا کیونکہ وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ مجھ سے اس نے کہا کہ پروین بابی بڑا خوبصورت لڑکا ہے مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ لڑکی ہے۔

کہتے ہیں دوستی کی بنیاد باہمی خوبیوں اور خامیوں پر ہوتی ہے۔ ہماری زیادہ ملاقاتیں ۱۹ اسیکٹر کی جنتا مارکیٹ میں ایک سبزی فروش کی دکان پر ہوتیں۔ وہ دکاندار نہایت صفائی پسند اور سلیقہ شعار تھا۔ وہ ہماری باتوں میں خوب دلچسپی لیتا اور اکثر اشارے سے اپنے بغل والے دکانداروں کی توجہ بھی ہماری طرف مبذول کروا دیتا۔ ہم وہاں کھڑے ہو کر سگریٹ کے کش لگاتے اور شعر و ادب کی باتیں کرتے۔ میری آخری ملاقات بھی اس کی موت کے دو روز قبل اُسی جگہ پر ہوئی۔ جب اس نے یہ شعر سُنایا۔

دستکیں دے رہا ہوں ڈر ڈر کے
مجھ سے ناراض ہیں سبھی گھر کے

میں نے داد دی اور کہا: - ماشاءاللہ ابھی جوان ہو، کیوں ایسے دل شکن شعر کہتے ہو۔ جواب میں فرمایا کہ "زندگی کا کیا بھروسہ، آج ہے کل نہیں"۔

جیسا میں نے پہلے عرض کیا وہ تیز رفتار تھا۔ اس نے اس کا ثبوت دیا اور اپنے تمام دوستوں سے سبقت لے گیا۔ سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔

خدا اُسے اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

جناب وید پرکاش ترکھا

اپنے بیٹے کی یاد میں

ہمارا آبائی وطن گوبند پور باہمنی والا تحصیل پاک پٹن ضلع منٹگمری (پاکستان) تھا۔ میرے پردادا شری گوبند رام پروونشل درباری آسیسر تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے زمینداری ہماری میراث رہی۔ پورے خاندان میں میرے تاتے پنڈت واسدیو ہی انگلینڈ سے ۵ برس تعلیم پاکر لوٹے اور چیف کالج لاہور میں پروفیسر ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ وطن کے بعد عجیب بے سروسامانی کے عالم میں ہم ہندوستان منتقل ہوئے۔ صرف ۵۰ روپئے میرے پاس تھے۔ ۴ لڑکے، دو لڑکیاں اور ایک دھرم پتنی کا ساتھ تھا۔ ان لڑکوں میں ستوز سب سے بڑا تھا۔ جالندھر آکر میں نے ٹرانسپورٹ کے محکمہ میں بحیثیت ایک کلرک ملازمت کرلی۔ سریندر اس وقت چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ زندگی جیسے تیسے گزرتی گئی اور سریندر بھی باشعور ہوتا گیا۔ بلا کا حسّاس ہونے کی وجہ سے وہ میرے ساتھ زندگی کی نیّا کا کھیون ہار بننا چاہتا تھا لیکن بچپن آڑے آجاتا تھا۔ اِدھر سریندر نے دسویں کا امتحان دیا، نتیجہ کا انتظار تھا۔ زمین الاٹ ہو ہی چکی ہے اب اسے بھی نوکری مل ہی جائے گی اتفاق سے انہیں دنوں جالندھر میں میری ملاقات رائے بہادر شری بدری داس سے ہوگئی جو اُن دنوں اخبار ٹریبون کے چیرمین تھے۔ میں نے اُن سے ذکر کیا تو موصوف نے سریندر کو ٹریبون میں ہی جگہ دے دی اور اسے انبالہ بھیجدیا۔ اس ملازمت کے ملنے کے بعد ہی سریندر کا نتیجہ آیا جس کے تحت وہ پاس ہوا تھا۔ ملازمت کے دوران ہی اس نے ادیب، عالم اور بی۔ اے کی سندیں حاصل کیں۔ مجھے تو اندازہ بھی نہ تھا کہ میرا یہ بیٹا ایک دن ایسا نام روشن کرے گا۔

اتنا لکھے گا اور دوستوں کا بڑا حلقہ بنائے گا۔ سچ پوچھئے تو اس کی زندگی میں مجھے یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ شاعروں کی مجلس میں ایک نمایاں شخصیت رکھتا ہے۔ سریندر کی ادبی حیثیت اس کے مرنے کے بعد معلوم ہوئی یعنی یوں کہوں کہ اس کے مرنے کے بعد ہی مجھے قربت اور دُوری کے صحیح معنیٰ معلوم ہوئے۔ وہ چلا گیا اپنی ماں کو چھوڑ کے، مجھے تڑپتا چھوڑ کے، اپنی غمزدہ اہلیہ، ایک بیٹے اور ایک بیٹی کو چھوڑ کے، ہمارے دُکھ کو اہلِ غم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اب تو صرف اس کی یادیں ہیں جو ہماری آنکھوں میں آنسوؤں کی طرح روشن ہیں۔

اس کے جانے کے بعد میری اور اہلیہ کی کیا زندگی؟ ہاں ایک تمنّا اور ایک گزارش ضرور ہے۔ مَیں یہ چاہتا ہوں کہ سریندر کی یاد کو قائم رکھنے کے لیے ایک اردو لائبریری قائم کر سکوں بوڑھا اور غمزدہ آدمی ہوں۔ یہ کام میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ اس میں مجھے اُردو ادیبوں کا تعاون درکار ہے۔

میں ہریانہ اردو اکادمی کا سچّے دل سے شکر گزار ہوں کہ اس نے سریندر کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے ادبی پروگرام بھی کیے، سوزؔ ایوارڈ بھی شروع کیا اور یہ کتاب بھی چھاپی ہے۔ اس کا صلہ بھگوان کی طرف سے ملے گا۔

میری پرماتما سے یہی پرارتھنا ہے کہ وہ سریندر کو اپنی شرن دیں اور اس کے بچّوں کو نیک اُٹھنے کی توفیق ــــ تاکہ سریندر کا بھی نام زندہ رہے اور میں بھی ناز کر سکوں۔

ابھاگیہ باپ
وید پرکاش نیّر کھا
"سریندر پنڈت سوزؔ سدن"
۶۱۶۔ سیکٹر ۱۱، پنچکولہ

جناب کشمیری لال ذاکر

وہ اب لوٹ کر نہیں آئے گا

سچ پوچھئے تو میں سریندر پنڈت سوز کے نام سے قطعی طور پر واقف نہیں تھا، اور شاید میں واقف نہ بھی ہوتا اگر میرا ٹرانسفر روہتک سے انبالہ چھاؤنی نہ ہو جاتا۔ انبالہ ایک ایسا شہر ہے جس کے بارے میں صرف مجھے اتنی واقفیت تھی کہ اس شہر سے ناصر کاظمی اور وقار انبالوی کی وابستگی تھی۔ میں اس شہر سے صرف گذرا ہی تھا کئی بار، لیکن شہر کے اندر جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، نہ انبالہ چھاؤنی میں اور نہ ہی انبالہ شہر میں۔ اس شہر سے گذرنا تبھی ہوتا تھا جب کبھی کسی میٹنگ کے سلسلے میں چنڈی گڑھ آنا ہوتا تھا۔ چنڈی گڑھ اکثر کار سے آتا تھا۔ اس لیے شہر کے باہر باہر سے نکل جاتا تھا۔ کبھی کبھار جب بس سے آنا ہوتا تو پھر بس اسٹینڈ پر گاڑی سے اُتر کر چائے کی ایک پیالی ضرور پیتا تھا یا پھر بک اسٹال پر ایک نظر ڈالتا تھا کہ کوئی اچھی کتاب یا میگزین مل جائے انبالہ چھاؤنی کے بس اسٹینڈ پر بسیں اب کم دیر کے لیے رُکتی تھیں لیکن جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس زمانے میں ہر بس قریب قریب آدھ گھنٹہ تو ضرور ہی رکتی تھی۔ بس اتنی واقفیت تھی میری انبالہ سے۔

لیکن جب میرا ٹرانسفر روہتک سے انبالہ ہوا اور سرکار نے مجھے نیلوکھیڑی میں شروع ہونے والے ایک خاص تعلیمی پروجیکٹ کی دیکھ بھال کرنے کے لیے انبالہ میں بلایا تو میں انکار نہ کر سکا حالانکہ میں جانتا تھا کہ انبالہ میرے لیے ایک دم اجنبی شہر ہوگا جہاں میرا کوئی بھی دوست نہ تھا۔ یہ اگست ۱۹۶۵ء کی بات ہے جب میں اپنا مختصر سا سامان

لے کر بحیثیت سرکل سوشل ایجوکیشن افسر انبالہ چھاؤنی کے ڈیویژنل انسپکٹر آف اسکولز کی عمارت میں وارد ہوا تھا۔ جس دوپہر میں انبالہ پہونچا تھا۔ میرے ساتھ میرا بھائی اوم بھی تھا۔ دراصل وہ اس لیے میرے ساتھ آیا تھا کہ انبالہ چھاؤنی میں اس کے دو دوست تھے۔ وہ اس خیال سے آیا تھا کہ اس کے دونوں دوست اس نئے شہر میں سیٹل ہونے میں میرے مددگار ثابت ہوں گے۔ اس میں سے ایک دوست کا نام بھاگ سنگھ سوڈھی ہے جو اسٹینڈرڈ ہوٹل کا مالک ہے۔ اس کے دوسرے دوست کا نام راجندر ملہوترہ ہے جو ان دنوں امپیریل تمباکو کمپنی کا سول ڈسٹری بیوٹر تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں شخص جو میرے چھوٹے بھائی کے دوست تھے، اب میرے بھی بہت عزیز دوست ہیں۔ راجندر ملہوترہ سے بھی میری ملاقات، بھاگ سنگھ سوڈھی کے ہوٹل میں ہی ہوئی، راجندر ملہوترہ نے ایک بلڈنگ ماڈل ٹاؤن انبالہ میں کرائے پر لے رکھی تھی جس کا کچھ حصّہ وہ بطور گودام استعمال کرتا تھا اور باقی کا حصّہ، جس میں اوپر والی منزل بھی شامل تھی، اپنے مہمانوں کو قیام کے لیے دیتا تھا۔ جب میرے بھائی نے راجندر ملہوترہ کو بتایا کہ میں کچھ مہینے اکیلا ہی رہوں گا تو اس نے فوراً یہ پیشکش کی کہ ماڈل ٹاؤن والی عمارت کا اوپر والا حصّہ خالی پڑا ہے اور میں وہیں قیام کروں۔ ملہوترہ کی یہ تجویز بھاگ سنگھ سوڈھی کو بھی پسند آئی اور یہ فیصلہ ہوا کہ بجائے اسٹینڈرڈ ہوٹل میں رہنے کے میں راجندر ملہوترہ کے ماڈل ٹاؤن والے مکان میں اپنا ٹھکانہ کروں۔ راجندر ملہوترہ کا یہ وعدہ تھا کہ وہ ہر روز صبح ایک بار مجھے ضرور ملے گا اور اس بات کا دھیان رکھیگا کہ مجھے اس کے مکان میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ راجندر ملہوترہ نے اس وعدہ کو اچھی طرح نبھایا۔ ہر طرح کی آسائش اور ہر طرح کا آرام مہیا کرنے کی کوشش کی۔ صبح کا ناشتہ کر کے میں اپنے آفس انبالہ چھاؤنی میں آجاتا تھا۔ دوپہر کو اکثر کھانا نہیں کھاتا تھا اور رات کا کھانا اسٹینڈرڈ ہوٹل میں کھا کر ماڈل ٹاؤن جاتا تھا۔

ایک دن راجندر ملہوترہ جب صبح مجھے ملنے آیا تو اس کے ساتھ ایک گورا سا اور

پیارا سا نوجوان بھی تھا جس کے ساتھ ایک عدد کتا بھی تھا۔ راجندر ملہوترہ نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا:۔

"ذاکر صاحب! یہ سریندر پنڈت سوز ہے، آپ کا ایک بہت بڑا ایڈمائرر۔"

سریندر پنڈت سوز نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور ہنس کر بولا:۔

"مجھے کبھی یہ گمان بھی نہ تھا کہ میں "سیندور کی راکھ" کے مصنّف سے انبالہ میں مل سکوں گا" اور پھر سریندر پنڈت سوز نے "سیندور کی راکھ" کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بیحد تعریف کی اور ناول کی کچھ لائینز حرف بہ حرف سُنائیں۔ میں حیران تھا کہ یہ نوجوان کتنی سوجھ بوجھ کا مالک تھا اور لٹریچر کے بارے میں کتنی زیادہ واقفیت رکھتا تھا؟ میرے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتایا کہ وہ ٹریبیون میں کام کرتا تھا اور میٹرک کرنے کے بعد ہی اس اخبار کے عملے میں شامل ہوگیا تھا اور کئی برسوں سے وہیں کام کر رہا تھا۔ اسے شعر و شاعری کا شوق تھا اور خود بھی شعر کہتا تھا۔ راجندر ملہوترہ نے اسے درمیان میں ٹوکتے ہوئے یہ بھی انفارمیشن دی کہ سریندر پنڈت سوز کو کُتّے پالنے کا بہت شوق تھا اور اس وجہ سے راجندر ملہوترہ سے اس کی دوستی تھی۔

اس انٹروڈکشن کے بعد وہیں میرے کمرے میں ہی چائے کی ایک ایک پیالی ہوئی پھر راجندر ملہوترہ انبالہ چھاؤنی چلا گیا اور سریندر پنڈت سوز ٹریبیون کے دفتر چلا گیا جو ان دنوں جگا دھری روڈ پر واقع تھا۔ پھر اس کے بعد کئی روز تک سریندر پنڈت سوز سے ملاقات نہیں ہوئی۔

پھر ایک دن یہ ہوا کہ ماڈل ٹاون والے بس اسٹاپ سے جب میں انبالہ چھاؤنی کے لیے بس میں بیٹھا تو وہ بھی اسٹارٹ ہو چکی بس میں چڑھتا ہوا مجھ تک پہنچ گیا اور پھر میرا ٹکٹ بھی اس نے ہی خریدا۔ میں جب اپنے آفس کے قریب کے بس اسٹینڈ پر اترنے لگا تو اس نے کہا کہ وہ شام کو مجھے اسٹینڈرڈ ہوٹل میں ملے گا۔ اس شام اسٹینڈرڈ ہوٹل میں یہ میری سریندر پنڈت سے دوسری ملاقات تھی۔

اس کے بعد اس سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ مجھے اکثر اچھے شعر سُناتا

رہا اور مجھ سے بار بار اصرار کرتا رہا کہ میں اپنی کہانیاں اسے دوں جن کا ترجمہ وہ ہندی اور انگریزی دونوں میں کرے گا۔ ہندی کہانیوں کے چھاپنے کے لیے اس نے انبالہ میں کسی پبلیشر سے بات بھی کرلی تھی۔ انگریزی میں ترجمہ کرکے میری کہانیاں وہ ٹربیون میں ہی چھپنے کے لیے دے گا۔ باتوں کے دوران اس نے بتایا کہ اس کی پروموشن ہوگئی تھی اور اب وہ ٹریبیون میں ہی لائبریرین بنادیا گیا۔ اس سے وہ بہت خوش تھا۔ اس نے کہا:۔

"اب میں اچھی کتابیں پڑھ سکوں گا اور آپ کو بھی اچھی کتابیں پڑھنے کے لیے دوں گا کیونکہ ٹریبیون میں جتنی بھی کتابیں ریویو کے لیے آتی ہیں سب سے پہلے مجھے ہی ملتی ہیں۔"

سریندر پنڈت سوز سے بس اس طرح میرے تعلقات استوار ہوتے۔ ابھی تعلقات کی استواری ابتدائی منزلوں میں ہی تھی کہ ۶ ستمبر کو پاکستان کے ہوائی جہازوں نے انبالہ پر بمباری کردی۔ اس سے کچھ روز پہلے جب دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑی تھی تو ہر رات سائرن گونجتے تھے، روشنیاں بجھادی جاتی تھیں اور سڑکیں، بازار، گلیاں سب سنسان ہوجاتی تھیں۔ ان دنوں میں شام کو بہت جلدی ماڈل ٹاؤن آجاتا تھا اور اب میں نے کھانے کا انتظام بھی گھر پر ہی کرلیا تھا کیونکہ بہت دیر باہر رہنا ممکن نہیں تھا شام کو اکثر سریندر پنڈت سوز میرے گھر آجاتا اور کافی دیر تک ہم شعروادب کی باتیں کرتے تھے۔

انہیں دنوں اس نے میری کچھ کہانیوں کا ترجمہ ہندی میں کرلیا تھا اور کتاب کا مسودہ کسی پبلیشر کو دینے والا تھا۔ سریندر پنڈت سوز جب بھی میرے گھر آتا اس کے ساتھ اس کا کُتّا ضرور ہوتا۔ لگتا تھا کہ کتّا اور سریندر پنڈت سوز دونوں ہی ایک دوسرے کو بے حد پیار کرتے تھے کیونکہ کتا بجائے کہیں اور بیٹھنے کے سریندر کے پاؤں میں ہی پڑا رہتا تھا۔ اگر وہ لمحہ بھر کے لیے بھی اپنی جگہ سے اُٹھتا تو کتّا بھی ساتھ ہی اُٹھ جاتا۔ سریندر پنڈت سوز کو ایک دوسرا شوق بھی تھا اور وہ تھا قلم جمع کرنے کا۔ اس نے قسم قسم

کے قلم جمع کر رکھے تھے اور اس کے کہنے کے مطابق وہ ہر روز نئے قلم سے لکھتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک بہت ہی خوبصورت پین مجھے پیش کیا اور کہا کہ میں تازہ کہانی اسی قلم سے لکھوں اور جب میں نے اس کے کہنے کے مطابق نئی کہانی اس کے دیئے ہوئے قلم سے لکھی تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ جب بھی نئے قلم لے گا تو اپنے علاوہ میرے لیے بھی ایک ایک قلم کا انتظام ضرور کرے گا۔ میرے پاس سریندر پنڈت سوز کا دیا ہوا قلم اب تک موجود ہے، جس سے میں نے ستمبر میں پہلی کہانی لکھی تھی۔ قلم تو بہت پرانا ہو گیا ہے لیکن میں اب بھی کبھی کبھی اسے جیب میں لگا لیتا ہوں اور اس طرح ان لمحوں سے رشتہ جوڑ لیتا ہوں جو انبالہ میں میں نے سریندر پنڈت سوز کے ساتھ گذارے تھے اور پھر ہوا یہ کہ ۶۵ء ستمبر کی بمباری سے ماڈل ٹاؤن میں میرے گھر کے نزدیک کے گھر میں بہت نقصان ہوا۔ چھاؤنی میں ملٹری اسپتال میں کچھ مریض زخمی ہوئے اور سارے انبالہ میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ جس رات میرے گھر کے ساتھ والے گھر پر بم گرا اور بم کے سپلنٹرز میرے گھر کی چھت پر گرے تو صبح ہونے سے پہلے جو دو شخص میرے گھر پہونچے ان میں ایک بھاگ سنگھ سوڈھی اور دوسرا سریندر پنڈت سوز تھا۔ وہ دونوں میری خیریت پوچھنے آتے تھے اور میں حیران تھا کہ اس افراتفری کے وقت میں وہ اپنی فکر کیے بغیر مجھ تک کیسے پہونچ گئے تھے۔

سریندر پنڈت سوز کی ملاقاتوں میں کچھ وقفہ اس لیے پڑ گیا کہ ہریانہ بننے کے بعد میرا ٹرانسفر چنڈی گڑھ ہو گیا اور ٹریبیون کا آفس چنڈی گڑھ میں منتقل ہونے میں بھی کچھ وقت لگ گیا۔ جب ٹریبیون کا آفس چنڈی گڑھ میں منتقل ہو گیا تو سریندر پنڈت سوز انبالہ سے ہر روز چنڈی گڑھ آتا تھا اور شام کو واپس انبالہ چلا جاتا تھا۔ بس یہی کارن تھے کہ سریندر پنڈت سوز سے میری ملاقاتیں کم ہوتی گئیں لیکن جب سریندر پنڈت سوز کو ٹریبیون کالونی میں مکان مل گیا تو پھر وہ بیوی بچوں سمیت یہیں شفٹ ہو گیا اور اس کی ملاقاتیں مجھ سے زیادہ ہونے لگیں۔ دراصل یہ ملاقاتیں ان خوبصورت لمحوں کی داستانیں ہیں جو ہم دونوں نے اکٹھے گذارے اور جن میں پھیلے ہوئے سکون اور

درد دونوں کیفیتوں کو ہم نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور الگ الگ ان سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

میں ان ملاقاتوں کو اگر گنوانا شروع کروں اور ان کی تفصیلات کا ذکر کروں تو ایک مکمل کتاب بن سکتی ہے۔ اس لیے ان کا ذکر بہت مختصر طور پر ہی کروں گا اور وہ بھی کہیں کہیں۔ چنڈی گڑھ آجانے سے سریندر پنڈت سوز کی ادبی زندگی کو ایک نیا موڑ ملا اور اس کی شخصیت میں کچھ نئے پہلو شامل ہوتے۔ انہیں دنوں اس نے اپنی مختصر کہانیاں انگریزی میں چھپوانا شروع کیں۔ کہانیاں ٹریبیون میں چھپتی تھیں۔ اس کی جب بھی کوئی نئی کہانی چھپتی، میں بڑے شوق سے پڑھتا۔ سریندر پنڈت سوز کو یہ بھی چاؤ رہتا کہ وہ مجھے ملے اور اپنی کہانیوں کے بارے میں میرا ردِّ عمل معلوم کرے۔ مجھے اس کی کہانیوں میں جو بات سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہ تھی کہ کہانی مختصر ہوتی اور اس میں روزمرّہ کے مسئلوں سے الجھتے کردار اپنی جدوجہد میں مصروف نظر آتے۔ اس کے چنڈی گڑھ آجانے سے میری وہ کہانیاں جن کو اس نے ہندی میں منتقل کیا تھا اس پبلشر سے کتابی شکل میں نہیں چھپ سکی تھیں جس سے اس نے چھپوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے اس کی ترجمہ کی ہوئی کہانیاں دلّی کے کسی دوسرے پبلیشر کو شائع کرنے کے لیے دیدی تھیں۔ جس روز میں نے اسے کہانیوں کا چھپا ہوا مجموعہ دکھایا تو وہ بے حد خوش ہوا پھر اس نے کہا:۔ "اس کتاب کا سیلیبریشن ہونا چاہئے ڈاکٹر صاحب۔"

میں نے اس کے کہنے کے مطابق کتاب کی اشاعت کا سیلیبریشن کیا لیکن اس سارے پروگرام میں سوائے سریندر پنڈت سوز کے اور اس کے دوست راجندر چاند کے جو ٹریبیون میں کام کرتا تھا تیسرا کوئی شخص موجود نہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سریندر پنڈت سوز نے پیاری پیاری اور نئی بحروں میں بڑی تیز رفتاری سے غزلیں کہنا شروع کی تھیں۔ پاکستانی شاعروں میں اسے منیر نیازی پسند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ منیر نیازی ہی کی طرح وہ بھی غزلیں کہے۔ وہ جب کبھی مجھے ملنے آتا جیب میں سے ایک آدھ مڑا تڑا کاغذ نکالتا اور اس پر لکھے ہوتے اشعار سُناتا۔ میرا مطلب یہاں اس کے اشعار کا ذکر

کرنا نہیں ہے، میں صرف اس کے ذہن کی اُپج اور ان نئے پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو دھیرے دھیرے اس کی شخصیت کو اپنی گرفت میں لیتے جا رہے تھے۔

اس کی شخصیت کا ایک نیا پہلو جو اَب تک میری نظروں کے سامنے کُھل کر نہیں آیا تھا، وہ اس کی شراب نوشی تھی۔ اس کے کئی نو آموز شاعر اور ادیب ساتھی بن گئے تھے اور اسے کسی نہ کسی بہانے شراب پلاتے رہتے تھے۔ میں نے دو ایک بار اسے ٹوکنے کی کوشش کی تو وہ ناراض ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے مجھ سے ملنا کم کر دیا۔ جب کسی محفل یا معاشرے میں اس سے ملاقات ہوتی تو وہ ہمیشہ مخمور نظر آتا لیکن ادب کا پہلو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا، اس لیے وہ جب بھی ملا جُھک کر ملا اور بڑے ادب سے پیش آیا۔

دراصل سریندر پنڈت سوز کی چھوٹی بڑی ڈھیر ساری تمنائیں تھیں، آرزوئیں تھیں۔ اس کے ذرائع محدود تھے لیکن اس کی سوچ کی پرواز بہت اونچی اور لمبی تھی۔ کئی دنوں تک اس پر فلمی گانے لکھنے کی دُھن سوار رہی اور اس سلسلے میں وہ پرڈیوسروں سے بھی ملتا رہا اور ان کے آگے پیچھے چکّر کاٹتا رہا۔ اس نے کچھ فلمی گیت مجھے سُنائے اور داد بھی چاہی۔ میں نے داد تو دی مگر یہ بات بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے فلمی زندگی راس نہ آئے گی۔ اسے ادھر جانے کے لیے اتنا اتاولا نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے معلوم نہیں میری اس بات کا اس پر کیا ردِ عمل تھا لیکن وہ اس نشے سے اپنے ذہن کو الگ نہیں کر سکا اور فلموں میں جانے کی سوچتا رہا۔

سریندر پنڈت سوز۔ بڑا رجائی قسم کا انسان تھا۔ اسے تاریکی میں روشنی کی کرن ضرور نظر آتی اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ سخت کڑے حالات میں سے گذرتے ہوئے بھی زندگی سے مایوس نہ تھا۔ جب کبھی کوئی اچھی کتاب پڑھتا، اس کا ذکر ضرور مجھ سے کرتا اور وہ کتاب مجھے بھی پڑھنے کو دیتا۔

اسے ایک ضد اور بھی تھی کہ اس کا کلام انگریزی میں چھپے، ایک دن میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس کی انگریزی نظموں کی کتاب کا دیباچہ خوشونت سنگھ نے

لکھا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جوں ہی کتاب چھپے گی اس کی پہلی جلد وہ مجھے پیش کرے گا۔ مَیں نہیں جانتا اس کی کتاب کیوں نہیں چھپی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیا واقعی اس نے اپنی انگریزی میں ترجمہ شدہ نظموں کو چھاپنے کے لیے کسی پبلشر سے بات کر رکھی تھی اور کیا واقعی خوشونت سنگھ نے اس کا دیباچہ لکھا تھا۔ میرے خیال میں یہ سب صورتیں حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے تھیں۔ اس کی شخصیت میں فرار کا پہلو آخری دنوں میں اتنا رچ بس گیا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو سجانے اور سنوارنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس کے بال سفید ضرور ہو گئے تھے لیکن اس کی شخصیت میں حسن اور خوبصورتی سے لگاؤ بڑھ گیا تھا۔

موت سے ایک ہفتہ پہلے وہ کافی رات گئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا: "ڈاکٹر صاحب زندگی میں پہلی بار مجھے ڈپریشن ہونے لگا ہے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ خواب جن کے لیے میں اپنا خون دیتا رہا ہوں مکمّل نہیں ہوں گے، اچھا مَیں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اچانک اپنی جگہ سے اُٹھا اور نہ جانے کیوں اس نے میرے پاؤں چھوئے۔ میں اسے اپنے مکان کے گیٹ تک چھوڑنے باہر اس کے ساتھ آیا اور پھر وہ پل بھر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پھر کئی روز تک وہ نظر نہیں آیا جس روز اس کی موت کی خبر آئی مجھے یوں لگا کہ چار پانچ روز پہلے جب وہ مجھے ملنے آیا تھا تو وہ اسکوٹر کو اسٹارٹ کر کے فوراً ہی تیزی سے ساتھ والی سڑک پر گھوم گیا تھا۔ اسے جیسے جانے کی بہت جلدی تھی۔ دراصل وہ مجھے تو اسی دن چھوڑ گیا تھا۔ شاید اس نے دنیا سے جانے کا کوئی راستہ تعیّن کر لیا تھا اور اس نے جی میں ٹھان لی تھی کہ اب اس راستے سے لوٹ کر واپس نہیں آئے گا۔ اس کے لیے فرار کا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا شاید۔

سریندر اب ہمارے درمیان نہیں۔ وہ اب مجھے ملنے کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن اس کی باتیں ہمیشہ یاد آتی رہیں گی اور جس غمناک انداز میں وہ مجھے شعر سُنایا کرتا تھا وہ انداز میری روح کو جھنجھوڑتا رہے گا۔ مَیں اس کا یہ شعر اکثر گنگناتا رہتا ہوں ؎

میں صندلی لباس ہوں مرنے کے بعد بھی
سب راستوں پہ اپنی مہک چھوڑ جاؤں گا

تیس سال پہلے پاکستانی ہوائی جہازوں کی بمباری کے بعد سات ستمبر کی صبح کو وہ میری خیریت پوچھنے آیا تھا اور سات ستمبر کو ہی دو سال پہلے میں اسے چِتا کی آگ کے شعلوں کے سپرد کر کے آیا تھا۔

قدرت کا کتنا بڑا مذاق تھا یہ!

ناشر نقوی

عرضِ مرتب

معنوی قدروں کا سفر

جعفر زٹلی، مولانا حالی، مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی، استاد داغ، میر مہدی مجروح، معروف، قتیل فرید آبادی، ممنون، آفتاب پانی پتی، جیمنی سرشار، زخمی حصاری وقار انبالوی اور بمل کرشن اشک کی سرزمین ـــــ "ریاستِ ہریانہ" کا ایک شاعر سریندر پنڈت سوز بھی موجودہ عہد کے معروف شعراء میں سے ایک تھا جس نے اپنے کلام میں شاعری کی بھرپور معنوی قدروں کو نبھاتے ہوئے اپنے شعوری مشاہدات سے الگ اپنی شناخت بنائی۔ سوز کی شاعری ایک سفر سے تعبیر کی جاسکتی ہے جس کی منزل ایک نئے جہانِ معانی کی تلاش تھی لیکن اس سفر پر سوز کی تیز گامی پورے طور پر کامیاب نہیں ہوسکی کیونکہ سوز کا سانس اُکھڑ گیا اور موت کے بے رحم ہاتھوں کو موقع مل گیا کہ اس نے شعور کی اُبھرتی ہوئی منفرد آواز کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

تقسیمِ وطن کے بعد سے ۱۹۵۲ء تک سوز کا تعلق انبالہ ضلع سے رہا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ انگریزی روزنامہ ٹریبون سے وابستہ ہوئے اس زمانے میں یہ اخبار انبالہ ہی سے شائع ہوتا تھا۔ ٹریبون کا دفتر انبالہ سے چنڈی گڑھ منتقل ہوا تو سوز بھی چنڈی گڑھ آگئے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد انہوں نے اپنی سکونت پھر ہریانہ کے شہر پنچکولہ میں اختیار کرلی۔

سریندر پنڈت سوز ایک تیکھے انداز کے شاعر ہونے کے ساتھ ایک معروف صحافی بھی تھے اور ادیب بھی۔ انہوں نے اُردو کے علاوہ انگریزی میں بھی بہت کچھ لکھا لیکن اپنے اظہار کا وسیلہ اپنی اُردو شاعری ہی کو سمجھتے تھے۔ ادبِ لطیف کے علاوہ دوسرے فنونِ

لطیفہ میں بھی ان کو کافی شغف تھا۔ علمِ نجوم اور موسیقی سے سوز کو گہری اُنسیت تھی۔ مختصر یہ کہ ان کی پوری زندگی سوز و ساز کا مرقع ہے۔ ان کی پوری شاعری داخلی حسیت کی غماز ہے سوز نے اپنی زندگی کے گردوپیش کو کبھی جز قرار دیا تو کبھی کُل' لیکن یہ محسوسات' تجربات اور مشاہدات جو بکھری ہوئی دنیا کو سمیٹنے میں لگے رہتے تھے خود نہ سمٹ سکے اس کی وجہ ان کے مزاج کا قلندرانہ پن بھی کہی جا سکتی ہے اور زندگی کی بے وفائی بھی لیکن سوز اپنے فن اور شخصیت کے حوالے سے "خوشبو کے سفیر" شاعر ضرور تھے ۔

میں صندلی لباس ہوں جلنے کے بعد بھی
سب راستوں پہ اپنی مہک چھوڑ جاؤں گا

سوز کی مہک تحریروں میں کچھ یوں بکھری کہ تمام ماحول کو زعفرانی بنا دیا۔ باوجود اس کے کہ سوز نے بڑے شہروں کی دُوری اور آپسی تعلقات کے درمیان اکثر واقع ہو جانے والی خلاء کو شدت سے محسوس کیا لیکن وہ اس دُوری اور مجبوری سے بھی مثبت نتائج نکالنے میں لگے رہتے تھے ۔

زردیوں کے شہر میں اُکتا گئی ہے زندگی
اب کے ہم کو پھول کوئی آسمانی بھیجنا

سوز کی شاعری میں حقیقی زندگی کی قدریں اپنے پورے احساس کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ وہ بھی عام انسان کی طرح اپنا ایک گھر بنانے اور بسانے کے خوبصورت خواب دیکھتے ہیں۔ ایسا گھر جو سکون دے جو دوڑتی بھاگتی زندگی کو راحت دے سکے۔ گھر کا یہ خواب سوز کا ذاتی بھی ہے اور کائناتی بھی ۔

خون اُبلتا ہے جہاں کھود و زمیں
گھر کہو وہ شخص بنوائے کہاں

اپنے گھر کس طرح وہ جائے گا
اس کا اک رہگزر سے رشتہ ہے

آوارگی کی دھوپ میں جلنا بجا سہی
کوئی تو شام اپنے بھی گھر میں رہا کرو

دستکیں دے رہا ہوں ڈر ڈر کے
مجھ سے ناراض ہیں سبھی گھر کے

سوزؔ کی غزلوں میں "شہر" ایک منفی علامت کے طور پر بار ہا استعمال ہوا ہے۔ آج کے مشینی عہد میں انسان اس قدر مصروف ہو گیا ہے کہ وہ اپنی روا داریوں کو بھی اپنی تیز گامیوں میں پیچھے چھوڑتا چلا جا رہا ہے۔ نئے عہد کا شہر ماضی کے شہر سے بالکل مختلف ہے۔ سوزؔ نے شہر کو بے راہ روی سے تعبیر کیا ہے جہاں انسان پس منظر کو بھول کر منظر کی طرف دوڑتا ہے۔

اک قبیلے کی طرح گھر میں رہا کرتے تھے
ہائے کیا لوگ تھے بچّوں میں جیا کرتے تھے

فاصلے رکھ کر کبھی یوں درمیاں، ملتا نہ تھا
شہر کے لوگوں سے اس کا تب کوئی رشتہ نہ تھا

رات بھر چاند کے درپن میں اِسے تکتا ہوں
اک زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے

نہ وہ انقلاب کا شور ہے نہ رسن ہے اور نہ وہ دار ہے
نہ وہ سرفروش ہیں شہر میں یونہی کارواں کا غبار ہے

اس سلگتے شہر میں سائے کہاں
برف کی سِل دھوپ میں جائے کہاں

کرم کی بھیک کہاں قاتلوں کی بستی میں
بدن کا خول اُٹھاؤ، لحد میں کھو جاؤ

کیا تعجب پھونک ڈالے روشنی اسکا بدن
جگمگاتے شہر میں ہرگز نہ ٹھہرانا اسے

سوز کی شاعری ان کے اُس مزاج کی بھی تصویر ہے جو دوسروں کے غم اپنے غم سمجھتا ہے۔ یہ وہ بڑا وصف ہے جو ہر آدمی کو میسّر نہیں ہوتا لیکن سوز نے کائنات کے دُکھ کو ذات کا دکھ سمجھا اور اس خوبصورتی سے اسے پیش کیا کہ شاعری کو درد کا درماں بنا دیا ہ

آفت زدوں کی طرزِ فغاں دیکھتے چلیں
ہر سمت اُٹھ رہا ہے دھواں دیکھتے چلیں

شاعری کے منضبط اُصولوں کے ساتھ صفتیں اور صنعتیں بھی سوز کے یہاں بڑی خوبصورتی سے استعمال کی گئی ہیں۔ صنعتِ تضاد میں کیا خوب شعر ہے ہ

عداوتوں کا جنوں ہے تو ساتھ ساتھ ہیں ہم
محبّتوں کے سفر میں بچھڑ بھی سکتے ہیں

سوکھے پتّوں کا گھر بنائیں گے
ریت پر کشتیاں چلائیں گے

حفاظت کر سکے جو آئینوں کی
وہ مجھ سے ایسے پتھر مانگتا ہے

سوز کی شاعری کا سفر ایک ایسی منزل کی طرف رہا جہاں لفظ تصویر بن جاتے ہیں لیکن ان کی ناوقت موت نے منزل سے پہلے ہی اس راہی کو اپنی گرفت میں لے لیا ——؟ اُردو کا ایک اچھا اور سچّا شاعر ذکر و فکر کی محفل سے اُٹھ گیا۔

سوز کی غزلیں۔ سوز کا لہجہ

کھُل کر برس گیا تو دھنک چھوڑ جاؤں گا
میں آسماں میں اپنی چمک چھوڑ جاؤں گا

پوچھیں گے سب رقیب مری قبر کا پتہ
اپنی کمائیوں کا نمک چھوڑ جاؤں گا

مرا نصیب سنگِ ملامت ہے دوستو
کچھ پائلوں میں اپنی کھنک چھوڑ جاؤں گا

اے شہرِ بے چراغ تری عمر ہو دراز
تاریکیوں میں تیری چمک چھوڑ جاؤں گا

میں صندلی لباس ہوں جلنے کے بعد بھی
سب راستوں پہ اپنی مہک چھوڑ جاؤں گا

پریتوں کی کوکھ سے اُجلی نشانی بھیجنا
ہو سکے تو اس برس جھرنوں کا پانی بھیجنا

زردیوں کے شہر میں اُکتا گئی ہے زندگی
اب کے ہم کو پھول کوئی آسمانی بھیجنا

روشنائی سے لہو کی میں نے لکھا تھا جسے
نامہ بر کے ہاتھ وہ میری کہانی بھیجنا

پھول کی ضد نے مجھے چھالے دیے ہیں عمر بھر
اب تو میرے واسطے شمعیں سُہانی بھیجنا

ہر نفس ہو مہکا مہکا، خواہشوں کی آنچ ہو
ریشمی ملبوس میں ایسی جوانی بھیجنا

تشنہ روحوں سا نہ بھٹکوں میں خلاؤں میں کہیں
جس کو پا کے جی سکوں وہ زندگانی بھیجنا

سرخرُو ہیں دوستوں اور دشمنوں سے آج ہم
تم سے ممکن ہو تو مرگِ ناگہانی بھیجنا

وہ صندلی سے ہاتھ جو میرے گلے میں تھا
میں رنگ و بو کی قید کے اِک سلسلے میں تھا

صحرا کی موت میرے مقدر میں لکھ گیا
جو شخص بادلوں کی طرح دیکھنے میں تھا

جب زلزلوں کی زد میں گھرا تھا مرا مکاں
اس وقت میرے دوستو میں میکدے میں تھا

اب قُربتوں کے حبس میں گھُٹنے لگا ہے دم
کتنا سکون دل کو کبھی بت کدے میں تھا

وہی پیپل ، وہی جوہڑ، وہی بانے دے جا
اے نئی نسل مجھے لوگ پرانے دے جا

ہے یقیں مجھ کو نہ پھوٹیں گے کسی موسم میں
جانے والے، مرے زخموں کو دہانے دے جا

ایک پتّے کی ہتھیلی پہ ہوں لرزاں کب سے
اوس کی بوند کو کرنوں کے نشانے دے جا

چہچہاتا رہوں تا عمر اسی آنگن میں
ان دریچوں میں ٹھہرنے کے ٹھکانے دے جا

تیری آواز کے سائے سے لگا بیٹھا ہوں
کبھی دستک کبھی خوشبو کے سرہانے دے جا

پیٹ کی آگ بجھاؤں کہیں چھپ کر میں بھی
بھیک ملتی ہو جہاں ایسے ٹھکانے دے جا

یوں ہی چلتا رہوں یادوں کے بیابانوں میں
کبھی خیرات میں اشکوں کے خزانے دے جا

اپنی خوشبو مرے سینے میں امانت رکھ دے
آنے والے نہ سہی گزرتے زمانے دے جا

فاصلے رکھ کر کبھی یوں درمیاں ملتا نہ تھا
شہر کے لوگوں سے اس کا تب کوئی رشتہ نہ تھا

وہ بکھر جاتا تھا ہر سو ایک خوشبو کی طرح
میں جدائی کے شجر پر اس طرح جلتا نہ تھا

زخم کب کے بھر چکے ہیں اس کی یادوں کے مگر
میں لپٹ کر اس طرح خود سے کبھی روتا نہ تھا

وہ لچکتی بیل سا رہتا تھا شانے پر مرے
قربتوں کی بھیڑ میں ظالم مگر کھلتا نہ تھا

وہ حقارت سے مجھے ٹھکرا کے خوش تو تھا مگر
میں بھی اپنے ظرف کے آگے کبھی جھکتا نہ تھا

تیز جھونکا سا گزر جاتا تھا دل کے صحن سے
وہ مری صورت مرے احساس میں ڈھلتا نہ تھا

وہ اپنی ذات میں گُم تھا نڈھال ایسا تھا
مزاج پوچھنے والے کا حال ایسا تھا

کوئی چراغ سا چہرہ اِدھر نہیں آیا
میں نامراد تھا یارو کہ سال ایسا تھا

دبا دیا تھا کسی ہاتھ کو اندھیرے میں
وہ جان جائے گا میرا خیال ایسا تھا

میں گردِ راہِ سفر تھا کہاں تھا نقش ہرا
الگ الگ تھا میں سب سے کمال ایسا تھا

وہ زہرِ قرب مجھے دے کے پھونک ڈالے گا
اسے غرور تھا اس کا جلال ایسا تھا

دعا سلام نہ ہوگی مگر بھی چھوڑوں گا
وہ ٹالتا بھی تو کیسے سوال ایسا تھا

—

یوں ہی ہلکی سی دستک دل پہ دے کے لوٹ جانے کا
ہنر آتا تھا اُس کو آہٹوں سے جی دکھانے کا

بچھاؤں میں تو کتنی سلوٹیں آنکھیں دکھاتی ہیں
سلیقہ اُس کو آتا تھا نئی چادر بچھانے کا

کہاں آسان تھا پکّی فصیلیں پھاند کر جانا
مگر اِک شوق تھا دل میں جنوں کو آزمانے کا

ملا کر ہاتھ اُس سے اِک دھواں اٹھا ہتھیلی سے
وہ کیوں بگڑا ابھا مجھ سے یہ نہیں قصہ سنانے کا

یہ میری سادگی کہیئے یا ان کا بانکپن کہیئے
مجھے انداز کب تھا اس طرح رشتے بڑھانے کا

میں اُس سے روز ملتا ہوں وہ میرا ہم نظر ٹھہرا
مرے یاروں کو اچھا شغل ہے خبریں اڑانے کا

ہوس کے ناگ کی مانند مجھ میں جاگ اٹھتا ہے
اسے حق ہے مری آنکھوں سے نیندیں بھی اڑانے کا

امر تھا، امر ہے، امر ہی رہے گا، یہ گنگا کا پانی چھلکتا رہے گا
دیا زندگی کا بجھے بھی تو کیا غم، محبّت کا دیپک تو جلتا رہے گا

تمہیں پھوٹنا ہے ہمیں ٹوٹنا ہے، سبھی بلبلے ہیں سبھی ہیں کھلونے
یہ سانسوں کا پنچھی اگر اُڑ بھی جائے، محبّت کا گلشن مہکتا رہے گا

کوئی بھی محبّت، کُلا بھی محبت، اسی میں مُرلیا اسی میں سنوریا
ہے میرا کے وِش کا پیالہ اسی میں، سُدھا کا یہ ساگر چھلکتا رہے گا

یہ سنگی ، یہ ساتھی ، یہ ملنا ، بچھڑنا ، یونہی ایک اندھے سفر کا دھواں ہے
مسافر یونہی آتے جاتے رہیں گے ، محبت کا سورج چمکتا رہے گا

جسے موت کہتے ہیں یہ دُنیا والے ، نگر پریم کا ہے محبت کا گھر ہے
نہ ہو کال کا ڈر ، نہ چنتا ہو پل کی ، نہیں تو یہ سینہ سُلگتا رہے گا

وہ پسِ مرگ نہ لاشے کو اٹھانے دے گا
میری آغوش میں رہ رہ کے سرہانے دے گا

تیری فطرت تو وہی خانہ بدوشی ٹھہری
زندگی تجھ کو بھلا کون ٹھکانے دے گا

خط پرانے ہی سہی آج دوبارہ پڑھ لیں
تو کہاں وقت ہمیں اگلے زمانے دے گا

پہلی سی غوطہ زنی بس میں نہیں ہے اس کے
اب مقدر نہ اُسے کُھل کے نہانے دے گا

میں سوا سچ کے کوئی بات نہ سوچوں گا کبھی
عہد یہ کب وہ بھلا مجھ کو نبھانے دے گا

یہ نئی نسل تو سُلفے کا دھواں ہے یارو
اب اسے کون ٹھہرنے کے ٹھکانے دے گا

اب نہ آئے گا کبھی روٹھ کے جانے والا
عمر بھر خط وہی پڑھئے گا سرہانے والا

وہ مراسم بھی نبھاتا ہے تو رسموں کی طرح
آگیا اس کو بھی دستور زمانے والا

یہ جدا ہونے کی رت ہے نہ دکھاؤ جی کو
ذکر چھیڑو نہ کوئی اگلے زمانے والا

میں نے یادوں کو کفن دے کے سُلا رکھا ہے
کون آئے گا یہاں ملنے ملانے والا

شدّتِ غم سے پگھل جاؤ گے اِک دن تم بھی
سیکھ لو ہم سے ہنر ہنسنے ہنسانے والا

خوب اُجاڑا ہے کئی بار دیارِ دل کو
جا بسا دور کہیں گھر کو بسانے والا

اب تو رسماً بھی مُلاقات نہ ہو گی اس سے
بس خیالوں میں چلا آئے گا جانے والا

وجدان کے مندر میں اسے صبح ملی تھی
وہ عقل کے سنسان جزیرے پہ مرا تھا

جس لاش کو چندن میں سجا رکھا تھا میں نے
وہ قتل بھی میرے ہی اشارے پہ ہوا تھا

وہ سرخ اناروں سا دہکتا رہا پہروں
میں اون کے گولوں سا سلاخوں میں اٹا تھا

تم بھی اسی دیوار کی اینٹوں میں چنے تھے
پھر سوز سے کیوں اس کی خموشی کا گلا تھا

سکھ کے رنگین خواب دکھا کر غیر ہوے فرزانے لوگ
فصلیں دکھ کی کاٹ رہے ہیں صدیوں سے دیوانے لوگ

قلب و جگر کی دھڑکن ہو یا بج اٹھتے ہوں دروازے
ایک ذرا سی آہٹ پر ہی لگتے ہیں گھبرانے لوگ

پل بھر کی دوری بھی جن سے ایک اچانک موت سی ہے
آنکھ کھلی تو اوجھل تھے وہ جیسے تھے افسانے لوگ

وہ جو زخم لیے پھرتے تھے گلیوں میں بازاروں میں
چارہ گروں کی بھیڑ میں آکر کھو ہی گئے انجانے لوگ

ان میں کس کا افسانہ ہے ان میں ہے کس کا راز نہاں
سوز تمہارے شعروں پر جو لگتے ہیں شرمانے لوگ

غم و آلام کے لشکر سے نہ تلوار کے ساتھ
جوئے خوں پھوٹ پڑی وقت کی یلغار کے ساتھ

لے اُڑی دردِ تہہ جام کرن سورج کی
تشنگی اور بڑھی صبح کے آثار کے ساتھ

راہ رو دیکھ کے چل رات کے سنّاٹے میں
گھات میں بیٹھے ہیں سائے کسی دیوار کے ساتھ

وہ نہ تھا پھر بھی نظر دل میں اُتر تی ہی گئی
ساعتِ ہجر بھی تھی ساعتِ دیدار کے ساتھ

سوئے تھے گیسوئے جاناں کا تصوّر لے کر
اور نیند اچٹی ہے زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

ہائے وہ منتظرِ دید حیا کا پیکر
کبھی دیوار سے ہٹ کر کبھی دیوار کے ساتھ

سننے والے تجھے کچھ اس کی خبر ہے کہ نہیں
لبِ شیریں بھی تو ہے گرمئ گفتار کے ساتھ

رُلائے گا خون آخری سانس تک
نہ یادوں کی تتلی کو مہمان رکھ

مہکیوں شرابوں کی جاتی نہیں
بلا سے تو منہ میں کئی پان رکھ

پرانے خطوں کو نہ کاغذ سمجھ
ہتھیلی پہ میری یہی دان رکھ

ملا تھا گئے سال سب یاد ہے
وہ آئے گا، ملنے کا ارمان رکھ

تو ہے کہ نہیں ہے عجب بات ہے
کبھی اپنی کوئی تو پہچان رکھ

خوشی کو غموں کا سمندر سمجھ
اُجالے میں آنکھیں نہ حیران رکھ

بچھڑتے ہی تم سے بکھر جاؤں گا
اب اس حادثے کا بھی امکان رکھ

پسِ حادثہ کام جو آ سکے
کوئی پاس ایسا بھی سامان رکھ

اِس سُلگتے شہر میں سائے کہاں
برف کی سِل دھوپ میں جائے کہاں

آبلہ پائی ہے جلتی ریت سے ہے
اس زمیں کے سر پہ اب سائے کہاں

وہ پلٹ آئے گا دنیا دیکھ کر
کوئی اس کی کھوج میں جائے کہاں

خون اُبلتا ہے جہاں کھو دو زمیں
گھر، کہو، وہ شخص بنوائے کہاں

تذکرے جس کے ہیں سارے شہر میں
کوئی اس کو ہم سے ملوائے کہاں

جو کھُلے موسم میں بھی ملتا نہیں
بارشوں میں میرے گھر آئے کہاں

جو ہوا اپنی اَنا سے خود ہلاک
قتل گاہوں سے وہ گھبرائے کہاں

اُداس اتنا کہ جیسے کبھی ہنسا ہی نہیں
وہ شخص دل کا کبھی راز کھولتا ہی نہیں

میں ہم کلام ہوں تجھ سے مجھے بتا تو سہی
وہ کون ہے جو مرا ساتھ چھوڑتا ہی نہیں

مجھے بھی ساتھ ہی رکھنا سفر کی گردش میں
بڑھوں جو خود کسی جانب یہ حوصلہ ہی نہیں

سلاخیں گرم کرو جسم داغ کر دیکھو
مرا وجود کسی غم ہی سے کھولتا ہی نہیں

کہیں تو کس سے کہ ہم دکھ کی داستاں ٹھہرے
نگر میں اپنا کوئی ہم زباں رہا ہی نہیں

مرا خلوص جو دیکھو تو دشمنی سمجھو لو
کہو کہ سوز سا یا زدہ کہیں ملا ہی نہیں

آفت زدوں کی طرزِ فغاں دیکھتے چلیں
ہر سمت اُٹھ رہا ہے دھواں دیکھتے چلیں

بجھنے کو ہیں چراغِ گل و لالہ دوستو
جورِ ہوائے شامِ خزاں دیکھتے چلیں

سنتے ہیں آجکل وہ ستم کی حدوں پہ ہے
اس شوخِ تند خو، کو جواں دیکھتے چلیں

یادوں کے گلستاں میں سسکتی ہیں پتیاں
کس حال میں ہے سروِ رواں دیکھتے چلیں

چمکا ہے کس کا چاند سا چہرہ سرِ فلک
کیوں مضطرب ہے موجِ رواں دیکھتے چلیں

شاید سکوں ملے دلِ حرماں نصیب کو
اعجازِ دستِ شیشہ گراں دیکھتے چلیں

نیشِ غمِ حیات گوارا کریں گے ہم
یوں اضطرابِ شوق کا چارا کریں گے ہم

رخصت گلوں کے حلقۂ رنگیں کی حسرتو
طوفانِ رنگ و بو سے کنارا کریں گے ہم

ہو گی غمِ جہاں سے جو فرصت کبھی نصیب
زلفِ خیالِ یار سنوارا کریں گے ہم

بڑھتا رہے بلا سے سکوتِ شبِ فراق !
ہرگز نہ اب کسی کو پکارا کریں گے ہم

شمعیں جلا کے غم کی، لٹا کر متاعِ ہوش
صدقے ترے جنوں کے اتارا کریں گے ہم

اے سوزؔ جل رہی ہیں خیالوں کی بستیاں
اٹھتے ہوئے دھوئیں کا نظارہ کریں گے ہم

اب زندگی سے میری مُلاقات بھی نہیں
آنکھوں میں اب لہو کی وہ برسات بھی نہیں

رشتوں کو دیکھتا ہے ترازو کی آنکھ سے
تیری طرح تو اُس کے خیالات بھی نہیں

وہ آ بسا ہے مجھ میں کسی عکس کی طرح
اُس سے بچھڑ کے جینے کے حالات بھی نہیں

اس قُربتوں کے شہر میں کچھ فاصلے بھی ہیں
وہ بھول جائے مجھ کو بڑی بات بھی نہیں

ویسے تو میرے اس سے مراسم نہیں رہے
جیسے کہ میرے ذہن میں صدمات بھی نہیں

وہ پھول کیا ہوئے وہ عنادل کہاں گئے
پہلے سے تیرے شہر میں باغات بھی نہیں

وہ دھوپ سا بدن ہے کرن آفتاب کی
اِک ہم کہ اب تو گرمیٔ جذبات بھی نہیں

میں زیست میں ہر آن ترے ساتھ رہا ہوں
رسماً ہی بتا دے کہ تجھے کیسا لگا ہوں

چُن دے کبھی دیوار میں اِک روز مجھے بھی
مدت سے تری راہ میں پتھر سا پڑا ہوں

جی بھر کے مجھے بہنے دے اشکوں کی ندی میں
اِک عمر کے بعد آج میں اپنوں سے ملا ہوں

گزرے گا وہی شخص کسی روز ادھر سے
اس خواب کے عالم میں بہت دیر جیا ہوں

تم بھی تو کسی روز بچھڑ جاؤ گے مجھ سے
یہ سوچ کے خود اپنے ہی سائے سے ڈرا ہوں

اس پھول کی خوشبو مری نس نس میں بسا دے
اے شوقِ ہوس در پہ ترے کب سے پڑا ہوں

میں نے سوچا ہے کہ اب ترکِ تمنّا کر لوں
زندگی جیسے گزرتی ہے گوارا کر لوں

لاکھ طوفان اُٹھیں لاکھ کنارے ڈوبیں
اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی پہ بھروسا کر لوں

ہوسِ شوق نہ تڑپائے نگاہ و دل کو
تیری دُنیا سے بہت دور بسیرا کر لوں

بجھتے جاتے ہیں سرِ شام امیدوں کے چراغ
کس کی یادوں سے دل و جاں میں اجالا کر لوں

کون میرے لیے تنویر لیے آئے گا
کس بھروسے پہ سرِ شام اندھیرا کر لوں

اپنی ویرانیٔ دل دیکھ کے جی چاہتا ہے
تیری باتوں، تری نظروں پہ بھروسا کر لوں

آیا ہے بھیک مانگنے اُجلے لباس میں
یہ شخص اپنے ملک کا معمار ہی نہ ہو

رہ رہ کے چومتا ہے بھلا کس لیے جبیں
یہ بھیڑیوں کی قوم کا سردار ہی نہ ہو

جو سب کو دیکھتا ہے حقارت کی آنکھ سے
وہ زندگی کی دھوپ سے بیزار ہی نہ ہو

سایا سمجھ رہے ہو جسے دُور دور تک
اس سائباں میں وقت کی یلغار ہی نہ ہو

اٹھو یہاں سے کہیں اور جا کے سو جاؤ
یہاں کے شور سے بھاگو کہیں بھی کھو جاؤ

لہو لہو نہ کرو زندگی کے چہرے کو
ستم گروں کی نوازش سے دور ہو جاؤ

کہاں پھرو گے غبارِ سفر کو ساتھ لیے
متاعِ درد کو دامن میں لے کے سو جاؤ

کرم کی بھیک کہاں قاتلوں کی بستی میں
بدن کا خول اٹھاؤ لحد میں کھو جاؤ

یہ سایہ دار شجر تو فریب دیتے ہیں
خزاں کے ساتھ رہو آندھیوں کے ہو جاؤ

یہ زندگی تو فریبوں کا آئینہ ٹھہری
اب اپنی کھوج میں بھٹکو فرار ہو جاؤ

یوں تیز آندھیوں کی نہ زد پر رہا کرو
چلتے مسافروں سے نہ دل کی کہا کرو

وہ کم سِنی کی شاخ پہ کھِلتا گلاب ہے
موجِ صبا کی طرح اُسے تم چھُوا کرو

آوارگی کی دھوپ میں جلنا بجا سہی
کوئی تو شام اپنے بھی گھر پر رہا کرو

احساس اُس فقیر کا فرقت سے چور ہے
آئے اگر وہ در پہ تو ہنس کر مِلا کرو

خوشبو تو سارے شہر میں اس کے بدن کی ہے
یوں ہی نہ عطر کان میں رکھ کر پھرا کرو

جو اس قدر خلوص سے ملتا ہے اِن دنوں
بن جائے میری زندگی یہ بھی دعا کرو

آیا ہے خاک چھان کے دشتِ ہوس کی وہ
بہتر یہی ہے اس سے نہ کوئی گِلا کرو

روز آتے رہو روز جاتے رہو
رسمِ دنیا یونہی بس نبھاتے رہو

سلسلے سانس چلنے کے قائم رہیں
دل دُکھاتے رہو یاد آتے رہو

یوں نہ پہلو سے اُٹھّو خدا کے لیے
گرم سانسوں کی دولت لُٹاتے رہو

ریت کا ہے نگر، ہم بکھر جائیں گے
تم بگولوں سے رسمیں بڑھاتے رہو

رنگ اور نور کے پیکروں میں ڈھلو
دودھیا چاندنی میں نہاتے رہو

دُکھ پگھلتا رہے چشمِ نمناک سے
کیسے اُجڑے تھے ہم یہ بتاتے رہو

اب نہ روٹھیں گے ہم اب نہ بچھڑیں گے ہم
بس یہی بات ہونٹوں پہ لاتے رہو

درد کے شہر میں ماتمی رات ہے
تم غزل سوز کی گنگناتے رہو

اب کے برسات دھوپ لائے گی
برف پگھلے گی باڑھ آئے گی

لوٹ جاؤں کھُلی فضاؤں میں
ورنہ شہروں میں بھوک کھائے گی

کس کی خوشبو ہے اس کے سانسوں میں
مَیں نے پوچھا تو روٹھ جائے گی

درد کا زہر اور پھیلے گا
مرثیے دل کے رات گائے گی

دیکھا نہ چاند — چاند کی تنویر دیکھ لی
جب تو نہ مل سکا تری تصویر دیکھ لی

سینے میں ایک شب بھی چراغاں نہ ہو سکا
اس روشنی کے شہر کی تقدیر دیکھ لی

آیا تھا ابر جھومتا — شعلے لُٹا گیا
پیاسی زمیں نے خواب کی تعبیر دیکھ لی

نکلا تھا اپنی راہ کے پتھر کو دیکھنے
لیکن خود اپنی ذاتِ انا گیر دیکھ لی

جب واہمے کے باب میں پہنچا ترا خیال
ہم نے بیاضِ قلب کی تحریر دیکھ لی

خالی ملا نہ کوئی قدم دُکھ کی گونج سے
ہم نے ہر ایک پاؤں کی زنجیر دیکھ لی

اُس سے بچھڑ کے دل کو منانے کی بات تھی
کالے سمندروں میں نہانے کی بات تھی

کیا کیجئے کہ ہم کو کوئی اور بھا گیا
ویسے تو ایک عمر نبھانے کی بات تھی

نس نس میں بس گیا تھا کوئی جو گیا بدن
خوشبو بدن میں اسکے جگانے کی بات تھی

لازم تھا اُس سے ترکِ تعلق کہ اسکے ساتھ
جو بات تھی وہ گذرے زمانے کی بات تھی

برگِ خزاں ہوں موج ہوا ہے میرا نصیب
شاخِ شجر کو اتنا جتانے کی بات تھی

اُس سے مِلا تو جسم کے پَر پھڑپھڑا اٹھے
خود سے ملے تو جسم سُلانے کی بات تھی

اے سوزؔ اُس کا ہاتھ ملانا بہانہ تھا
لکھّا ہوا نصیب مٹانے کی بات تھی

لاکھ چاہا کہ ذکرِ وطن چھوڑ دیں لے نہ بدلی مگر اپنی تحریر کی
رقص کرتی ہوئی زندگی جانے کیوں آج محتاج ہے ایک زنجیر کی

یوں لہو تھا تپاں رات کی گود میں سب نمودِ سحر کے گماں میں رہے
کتنے شعلوں میں لپٹی رہیں خواہشیں لاش کیسے اُٹھی اپنی تعبیر کی

مثلِ برگِ خزاں دیدہ اڑتے رہے تند آندھی کہاں سے کہاں لے گئی
گرتے پھولوں نے یوں تو کفن بھی دیا پیش چلتی کہاں کوئی تدبیر کی

اپنا کشکول خالی ہے خالی رہے، صبحِ فردا تری مانگ بھر جائیں گے
تو ہو مانگتی ہے تو پھر دیر کیوں، کُندیوں بھی نہیں دھار شمشیر کی

راکھ کے سرد ڈھیروں میں کیا کچھ نہ تھا، کوئی سُنتا تو آواز دیتے اُسے
اپنی بے چارگی سر نگوں ہو گئی بات چلتی رہی اپنی تقدیر کی

دشت تھا دھول تھی خار راہوں کے تھے، اپنے سائے کی پہچان جاتی رہی
تیرگی کا تلاطم اُبھرتا رہا شکل دھندلا گئی میری تصویر کی

آموں کی کومل شاخوں پر آنے لگا ہے بور اے پنچھی
کیا بنجر دھرتی کا سنکٹ ہو جائے گا دور اے پنچھی

آنسو آنسو آنکھوں کو اب ڈھارس کون بندھائے گا
کیا ہم تم کیا دُکھ کے ساتھی ہر کوئی مجبور اے پنچھی

کیا تیرا کیا میرا دُکھ ہے، ایک بھیانک روگ ہے یہ
زخم کوئی ہو دھیرے دھیرے بن جائے ناسُور اے پنچھی

دل کے چھالے ہیرے موتی آنکھیں ساون بھادوں ہیں
پیار میں جو کچھ بھی مل جائے ہم کو سب منظور اے پنچھی

کیا جانیں کس گھاٹ اُتاریں اس بستی کے لوگ انھیں
شہرِ وفا کو جانے والے بیٹھے ہیں مجبور اے پنچھی

ساری دنیا ہی ایسی ہے، سوز پہ کیا الزام دھریں
آنکھ ملا کر نین چُرانا دُنیا کا دستور اے پنچھی

دستکیں دے رہا ہوں ڈر ڈر کے
مجھ سے ناراض ہیں سبھی گھر کے

ٹوٹ کر میں بھی گرنے والا ہوں
دکھ سمجھتا ہے وہ بھی اندر کے

شور کرتا ہے کب وہ جھرنوں سا
حوصلے جس کے ہوں سمندر کے

جانے کتنے دیے وہ لایا ہے
اپنی آنکھیں لہو لہو کر کے

میں بھی چلتا ہوں نیند میں اکثر
صبح کرتا ہے وہ بھی مر مر کے

کاٹ گہری زباں کی ہوتی ہے
بھر ہی جاتے ہیں زخم خنجر کے

مجھ سے کترا کے خود میں سمٹا ہے
مجھ کو میرے ہی روبرو کر کے

اِک قبیلے کی طرح گھر میں رہا کرتے تھے
ہائے کیا لوگ تھے بچّوں سے جیا کرتے تھے

رات بھر چاند کے درپن میں اسے تکتا ہوں
اِک زمانہ تھا کہ ہم روز مِلا کرتے تھے

تشنگی اپنا مقدر ہے تو اب کیا کہیئے
ہم سمندر کی طرح سب سے مِلا کرتے تھے

تہمتیں اب تو مقدر کی لکیریں ٹھہریں
حادثے ایسے کہاں روز ہوا کرتے تھے

اپنے دامن کا کوئی تار سلامت ہی نہ تھا
ورنہ توہینِ رفو ہم بھی کیا کرتے تھے

غم کے ناگوں سے کہو اب تو انھیں بھی ڈس لیں
جو شرابوں میں ہمیں زہر دیا کرتے تھے

وہی کھڑکی وہی در مانگتا ہے
یہ دل کیوں بہتے منظر مانگتا ہے

حفاظت کر سکیں جو آئینوں کی
وہ مجھ سے ایسے پتھر مانگتا ہے

مری پلکوں پہ ہیں پر تیں لہو کی
وہ اشکوں کے سمندر مانگتا ہے

کبھی جو اپنے وقتوں میں سخی تھا
وہی اب بھیک در در مانگتا ہے

یونہی مِلتے رہیں ہم ہر جنم میں
دعا یہ دل برابر مانگتا ہے

سمندر میں رہوں پانی کو ترسوں
وہ مجھ سے کیسے منظر مانگتا ہے

رونقیں میرے گھر کی بڑھا دیجئے
کوئی جھوٹی خبر ہی اڑا دیجئے

کتنے جنموں سے اس کے تعاقب میں ہوں
اس جنم میں تو اس سے ملا دیجئے

فاصلوں کی صلیبیں نہ لہرائیے
قربتوں کے نگر کی ہوا دیجئے

میرے زخموں پہ آنسو مناسب سہی
دستِ قاتل کو بھی تو دعا دیجئے

سُوکھے ٹکڑے حلق سے اُترتے نہیں
گھونٹ پانی کہیں سے پلا دیجئے

چیتھڑوں کے تبسّم پہ زندہ رہوں
میرے گھر میں رفوگر بٹھا دیجئے

پوچھ کر اس سے اس کو تو چاہا نہ تھا
مجھ کو میرے کیے کی سزا دیجئے

ناحق لہو کا پھاگ ابھی چشمِ تر میں ہے
مقتل سا اک مقام ہماری نظر میں ہے

جو ہو سکے سمیٹ لو دامن میں اوس کو
شعلہ چمکتی دھوپ کا شاخِ شجر میں ہے

اُلجھے ہوئے ہیں وقت کی موجِ بلا سے ہم
اک کشمکش ضرور مگر بال و پر میں ہے

خوں سے بھرے لباس کے پرچم ہیں ہاتھ میں
اِک تازہ انقلاب تلاشِ سحر میں ہے

چھاگل چھنک کے پاؤں کی زنجیر بن گئی
اِک گونج سی بسی ہوئی دیوار و در میں ہے

خواب بن کر سو رہوں یا دفن ہو جاؤں کہیں
نیند کا گھنگھور بادل ہر طرف چھایا تو ہے

پَر لگا کر اُڑ ہی جاؤں گھر کی دیواروں سے دُور
دُور کی نگری سے پیغامِ وفا آیا تو ہے

دل کی دیواروں پہ اس کا نام ہے لکھا ہوا
بارشوں کی زد میں اکثر میرا گھر آیا تو ہے

اب کہاں تیرے مقدر میں وہ پہلی قربتیں
رات بھر میں نے دلِ وحشی کو سمجھایا تو ہے

نہ وہ انقلاب کا شور ہے نہ رسن ہے وہ نہ وہ دار ہے
نہ وہ سرفروش ہیں شہر میں، یونہی کارواں کا غبار ہے

نئی نسل سے کوئی طفل دے جو شہادتوں کا پیام ہو
میرا کل بھی قتل نہ ہو کہیں، نئی صبح میرا وقار ہے

مجھے طیش میں نہ تو لا یونہی، مرے غیظ کو تو ہوا نہ دے
مجھے مشقِ تیر و سناں بھی ہے، میرا وار موت کا وار ہے

میرے ہاتھ خون میں تر سہی، میرے پاؤں شل ہیں تو کیا ہوا
یہی بیڑیاں ہیں زباں مری، یہی طوق میرا اقرار ہے

تو نے مسئلے پہ زبان کے جو کیے تھے قتل وہ یاد کر
مرے قاتلوں کا سفیر تو، تیرا ظرف خون کی دھار ہے

سبھی پیڑ کاٹ کے پھینک دو، نہ درند ہوں نہ پرند ہوں
ہو چمن کا حشر یہی کہ اب یہ خزاں ہی اصل بہار ہے

یونہی دُلہنیں نہ سجا ابھی، یونہی ڈولیاں نہ اٹھا ابھی
ہے رواج قتل کا شہر میں، وہی سیم و زر کا خمار ہے

ہجر کے صحراؤں کو کب تک یادوں سے مہکاؤ گے
وصل کے ہار پرونے والو تم تنہا رہ جاؤ گے

اس کے در پر دستک دینا یوں تو اچھا لگتا ہے
اس نے مقصد پوچھ لیا تو چہرہ کہاں چھپاؤ گے

آنسو پینا، زخم چھپانا، کوئی آساں کھیل نہیں
گم صم رہ کر جینے والو تم آخر مر جاؤ گے

اس کی تحریروں سے جیسے اس کا چہرہ اُبھرے گا
کب تک اس دیوانے پن پر رہ رہ کر اتراؤ گے

کیا کیا کرتے نہیں تھے اس سے تنہائی کے لمحوں میں
وہ کیوں کر ناراض ہوا تھا کس کس کو بتلاؤ گے

شہرِ غم کی دیواروں پر موت کی مستی چھائی ہے
یاس کی کالی آندھی اب کے خون کے چھینٹے لائی ہے

دُکھ کی اِک دیوار گری ہے دل کے نازک شیشے پر
یادوں کے برباد نگر سے دیکھ ہوا کیا لائی ہے

دل کے دُکھتے زخم چھپالو دھوپ اِنھیں تڑپائے گی
بستی بستی انگارے ہیں قدم قدم پُروائی ہے

ہر کوئی دل کا رونا روئے اس بستی کی گلیوں میں
ریت کی چادر سر پر اوڑھے ہر ذرّہ سودائی ہے

قہر کا سورج بن کے تپے گا زخمِ کہن کا انگارہ
سوز میں ڈوبی شہنائی نے ایسی آگ لگائی ہے

کاٹ لیا ہے عشق کا سینہ عہدِ وفا کی آری سے
اَن بجھ آگ لگا بیٹھے ہیں یادوں کی چنگاری سے

کاہے دُکھ بانٹو ہو یارو کاہے پریت جتاؤ ہو
سانس کی ڈوری کٹ جاتی ہے چھوٹی موٹی یاری سے

میں کوئی تصویر نہیں جو دیواروں کی بھینٹ چڑھوں
جینا دل کی آگ میں جل کر اور مرنا خودداری سے

جلتا کاغذ چھوڑ گیا وہ تیز ہوا کے جھونکوں میں
دیکھے ہے اب دُور بیٹھ کر تا کے ہے عیاری سے

پلکوں تک جو غم آئے تو ساون کی برسات ہوئے
گرے کسی کے دامن پر تو تاروں کی بارات ہوئے

عمریں گزریں دیکھ نہ پائے اس چہرے کی دھوپ کو ہم
اس کی کھوج میں ہم ہی آخر دن سے کالی رات ہوئے

گلشن گلشن کلیاں مہکیں آنگن آنگن پھول کھلے
بھری بہاروں کے دامن میں ہم پت جھڑ کے پات ہوئے

روشن ایوانو سے نکلو اترو اونچے محلوں سے
تہہ خانوں میں جاکر دیکھو کیا سے کیا حالات ہوئے

کھویا کھویا تنہا تنہا چپ سی سادھے رہتا ہے
ایک زمانہ بیت گیا ہے سوز سے اپنی بات ہوئے

یوں تو کہنے کو مجھے شہر کا گھر گھر جانے
میرے اپنے ہی مجھے آنکھ کا کنکر جانے

درد بانٹے ہیں سبھی یار نجومی بن کر
ہم سے بنجاروں کا ہر شخص مقدر جانے

ہر چمکتی ہوئی تصویر کے پیچھے بھاگے
دل تو نازاں ہے کہ شیشے کو بھی مرمر جاتے

دل میں کیا کیا ہے مرے کیسے بتاؤں تجھ کو
اپنی گہرائی بھلا کیسے سمندر جانے

کس سے امیدِ وفا کیسا وفاؤں کا صلہ
وہ تو ہر عہد کو ہر بات کو نشتر جانے

اب تو جلتا ہے وہ نہ بجھتا ہے
بے حسی کا دھواں سا لگتا ہے

کیا دیا تو نے کیا لیا اس نے
کس کے ٹکڑوں پہ کون پلتا ہے

اپنے گھر کس طرح وہ جائے گا
اس کا ہر رہگزر سے رشتا ہے

مان جاتا ہے پاس آنے کو
پھر کسی حادثے سے ڈرتا ہے

منہ پہ تعریف کیا کروں اس کی
وہ جو چہرے کئی بدلتا ہے

دل کو یاد اس کی بھی نہیں آتی
جو مری چشمِ تر میں رہتا ہے

یہ تو رشتے جنم جنم کے ہیں
کون ورنہ کسی سے ملتا ہے

ٹوٹے بربط سے جو نغموں کی صدا مانگے ہے
وہ میرے جسم کو اب سر سے جدا مانگے ہے

کتنے خنجر ہیں رگِ جاں کو جھٹکنے کے لیے
شوق اُس شوخ کی بس ایک ادا مانگے ہے

یوں تو شیریں ہے بہت تیرے لبوں کا امرت
دلِ وحشی تو کوئی تلخ دوا مانگے ہے

پھر کسی شاخ سے پتّے نے رہائی مانگی
پھر کوئی پھول مہکنے کی سزا مانگے ہے

ہم لہو میں بھی نہائے ہیں تو اشکوں میں کبھی
جوششِ گریہ کوئی جبر نیا مانگے ہے

ہم مسافر ہیں ہمیں راہ میں روکے نہ کوئی
ہر نفس اپنا تو منزل کی ہوا مانگے ہے

پھر ہوا کے قہر سے ڈرنے لگے
ہم چراغوں میں لہو بھرنے لگے

زندگی ساد ھا ہوا اِک شہر ہے
لوگ کیوں یہ شور سا کرنے لگے

انگلیوں کو خون سے لت پت کرو
کیوں خطوں سے گفتگو کرنے لگے

کیا کرو گے کھو کھلے سایوں میں تم
اس نگر کے شب شجر جھڑنے لگے

رُخ ہواؤں کا مخالف ہے ابھی
آندھیوں سے کیوں دیئے لڑنے لگے

کاٹ کر اپنی زباں خون اُگلتے رہئے
نارِ احساس میں تا عمر جُھلستے رہئے

میں تو احساس ہوں سینے میں اُتر جاؤں گا
آپ شعلوں کی لپک ہیں تو بھڑکتے رہیے

قرض سانسوں کا ابھی اور چُکانا ہے مجھے
آپ کچھ دیر رگِ جاں کو مسلتے رہئے

دُور ہے شہرِ جنوں، دُور بہت دُور ابھی
آپ چاہیں تو گریباں سے اُلجھتے رہیئے

وقت ٹھہرا ہے کہیں، اور نہ ٹھہرے گا کبھی
لوگ کہتے ہیں کہ رفتار بدلتے رہیئے

عشق کی اندھی نہر میں جب بھی یہ دل غوطے کھائے ہے
اس کی یاد کا پاگل جھونکا پہروں خون رلائے ہے

ٹھنڈی سانسوں کے دروازے گرم ہوا سے کھُلتے ہیں
اس کے جسم کا لاوا مجھ کو تانڈو ناچ نچائے ہے

مجھ میں اتنا نور کہاں جو کالی راتیں روشن ہوں
تیرے رخساروں کا شعلہ دیپ سے دیپ جلائے ہے

الھڑپن میں عشق کی باتیں ریت کی دیواریں جیسے
وہ کیٹی وہ چھلیا مجھ سے اب بھی پریت جتائے ہے

ہنستی گاتی بوچھاروں میں جھولوں کو مالا پہنائیں
رنگ رنگیلی بدلی گورے جسموں میں گرمائے ہے

رشتوں کے شمشان میں کب سے الکھ جگائے بیٹھا ہوں
میرا اپنا پن بھی مجھ سے اب تو آنکھ چُرائے ہے

یہ بھی سوچا ہے سدا روٹھ کے جانے والے
روٹھ سکتے ہیں کبھی خود بھی منانے والے

اب وہ پہلا سا نہ ہنسنا ہے نہ رونا میرا
میرے آنگن میں نیا سال منانے والے

اب نہ امید کے سائے ہیں نہ دستک کوئی
جانے کس سمت گئے روٹھ کے جانے والے

میں بھی مُرجھائے ہوئے ہار لیے پھرتا ہوں
شہر در شہر نئے پھول کھلانے والے

پھر وہی طنز کے نشتر ہیں زباں پر اس کی
پھر وہی شغل ہے ہنستوں کو رُلانے والے

مخلصانہ ہے مری اس سے ملاقات مگر
تہمتیں پھر بھی لگائیں گے لگانے والے

سوکھے پتّوں کا گھر بنائیں گے
ریت پر کشتیاں چلائیں گے

زندگی سوُد خور ہے پھر بھی
قرض جتنا ہے سب چکائیں گے

نیند اس کے حساب میں لکھ کر
رتجگوں کا جہاں بسائیں گے

بددعا اس کی لے کے آنکھوں پر
ہم سرابوں کو لوٹ جائیں گے

سادگی اس کی اک شوالہ ہے
ہم بھبوتی رما کے آئیں گے

اس کے تپتے بدن کو چھوتے ہی
ہم سمندر میں ڈوب جائیں گے

کیا دیر کریں اس سودے میں بچوں کو منھ دکھلانا ہے
بس چند نوالوں کی خاطر ہم لوگوں کو بک جانا ہے

اخبار پرانے بیچ آؤ، جو دام ملیں گھر لے آؤ
گھر آئے مہمانوں کے لیے آٹا تو آخر لانا ہے

میں اگلے برس جیسا بھی ہوا اک کوٹ نیا بنوا لوں گا
اس پھٹے پرانے کمبل سے فی الحال تو کام چلانا ہے

تم اپنے لہو کے چھینٹوں سے شاداب کرو گل بوٹوں کو
پت جھڑ کے کالے ناگوں نے اک دن تو پھن پھیلانا ہے

تم اپنے اپنے گھر جاؤ خود لاش اٹھا لوں گا اپنی
دستور پُرانے چھوڑو بھی ہم سب کو اکیلے جانا ہے

کچھ ہنسی خوشی کی بات کریں کچھ لمحے ساتھ بتالیں گے
آخر تو ہم بنجاروں کو یہ بستی چھوڑ کے جانا ہے

میں اپنے دکھ کے لاشے پر تصویر سجا لوں گا تیری
بے سوُد عبادت کا مجھ کو اِک دن تو سوگ منانا ہے

سامان بے حساب تھا تن پر قبا نہ تھی
اس شخص کے نصیب میں تازہ ہوا نہ تھی

چونکے تو اس طرح کہ بہت سو لیے تھے ہم
کوئی بھی رات جیسے کہ خواب آشنا نہ تھی

اک بے کفن سی لاش سا میرا وجود تھا
بے چارگی کا دشت تھا میری صدا نہ تھی

لو روشنی کے شہر نے آنکھیں بھی چھین لیں
اس زندگی سے اور کوئی بہتر سزا نہ تھی

بدبختیوں کی دار پہ خندہ بلب تھا میں
میرے لبوں پہ آج بھی کوئی دعا نہ تھی

آنکھیں لہو کی جھیل تھیں ہونٹوں پہ زہر تھا
ہر اِک ادا میں قہر تھا وہ بے وفا نہ تھی

سورج کی تیز دھوپ سے ایندھن ہوئے بدن
کیا آسماں کی کوکھ میں کوئی ہوا نہ تھی

ہر بوٹا ہر پھول چمن میں چلنے کو تیار لگے
اس گلشن کا مالی مجھ کو چور لگے عیار لگے

تم بھی خون کی ہولی کھیلو نیزوں کا بیوپار کرو
ہر پل تازہ قتل تو جیسے گنگا کی جل دھار لگے

آج اپاہج لوگوں پر جو تیر چلا کر آیا ہے
یہ خونی تو یارو مجھ کو بستی کا سردار لگے

اِک موسم تھا روکھے پن میں سچی باتیں کرتا تھا
اب تو اس کا اپنا پن بھی بوجھ لگے انبار لگے

آتے جاتے گھیر کے سب کو عطر لگاتا پھرتا ہے
رنگ رنگیلے جوڑے والا نیا نیا زردار لگے

تم تو روز کہا کرتے تھے پھولوں کی مہکار ہے وہ
سوزؔ تو کم عمری میں مجھ کو بوڑھا اور بیمار لگے

میں ہوں میرا پچھلا پہر ہے سارا رستہ خالی ہے
ٹوٹ کے گر جائے گا آخر جسم تو سوکھی ڈالی ہے

ساون اب اک تانا سا ہے برکھا رُت اِک گالی ہے
اب کے برس تو ہم نے اپنے گھر کو آگ لگالی ہے

پھل توڑے ہیں اور کسی نے میری مانو سچ جانو تم
جس کو پیڑ سے باندھ آئے ہو وہ اس باغ کا مالی ہے

دیکھ فقیر اب آ پہونچے ہیں اے بابا کس نگری ہیں
ہر اک چہرہ چھلنی چھلنی ، ہر اک جسم سوالی ہے

کتنے اپنے کتنے چھلیا گھات لگائے بیٹھے ہیں
کیسے سب کی جھولی بھر دوں ہاتھ تو میرا خالی ہے

اپنے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں کس پہ دھریں الزام میاں
ہم نے اب اپنے کاندھے پر اپنی لاش اٹھالی ہے

میرے گھر آنے والی ہے تنہائی کے ساتھ اداسی
یاد کسی کی خنجر بن کر دل میں اترنے والی ہے

آموں کی کومل شاخوں پر آنے لگا ہے بور سکھی ری
کیا بنجر دھرتی کا سنکٹ ہو جائے گا دور سکھی ری

راجہ رنگ بھرے ہیں دونوں پیلا چولا پہن اب تو
اودھ پوری کی مہارانی کا، پھیکا ہے سندور سکھی ری

دل کے چھالے ہیرے موتی، آنکھیں ساون بھادو ہیں
پیار کے خاطر مل جائے، ہم کو سب منظور سکھی ری

کیا جانیں کس گھاٹ اُتاریں اس بستی کے لوگ اُنہیں
شہرِ وفا کے جانے والے بیٹھے ہیں مجبور سکھی ری

کیا تیرا کیا میرا سجنی دُکھ ہے ایک بھیانک روگ
زخم کوئی ہو دھیرے دھیرے بن جائے ناسور سکھی ری

آنسو آنسو آنکھوں کو اب ڈھارس کون بندھائے گا
کیا ہم تم، کیا دُکھ کے ساتھی ہر کوئی مجبور سکھی ری

ساری دنیا ہی ایسی ہے سوز پہ کیا الزام دھریں
آنکھ ملا کر نین چُرانا دُنیا کا دستور سکھی ری!

گیت

وہ جب پاس آتا ہے   یہ کیا کر جاتا ہے
مجھے ڈس جاتا ہے   یہ دو مُنھی سا ظلمی
بہت تڑپاتا ہے
یہ کیا کر جاتا ہے

نہ من کے سُنے وہ دو ہے   نہ میری باٹ ہی جو ہے
اسے مری بات نہ سوہے   نہ تن کی بھاشا سمجھے
مجھے کیوں سبھاتا ہے
یہ کیا کر جاتا ہے

میں برہن کس در جاؤں   ڈرائے سے ڈر جاؤں
میں اس پر مرتی جاؤں   اٹھی ہے پھانس سی دل میں
وہ کیوں ٹھکراتا ہے
یہ کیا کر جاتا ہے

چھٹا ہر چال میں میری ہے بجلی تال میں میری
گلابوں کی بگیہ ہوں سُنے اس حال میں میری

یوں ہی شرماتا ہے
یہ کیا کرجاتا ہے

کبھی باہوں میں بھر لے وہ اپنے نام ہی کر لے
وہ بانکی چتون والا اک اچھا کام ہی کر لے

یوں ہی گھبراتا ہے
یہ کیا کرجاتا ہے

بکھرے موتی بکھری فکر

اپنے گھر میں نہ رہا غیر ہوا ہرجائی
پھر مری ذات سے منسوب ہوئی تنہائی

دُکھ تو بڑ کا پیڑ ہے بھائی کیا کاٹو گے کیا چھانٹو گے
درد کی دنیا اپنا حصّہ کیا رکھو گے کیا بانٹو گے

بتا اے فلک پھر کہاں برق گرتی
ہمارا اگر آشیانہ نہ ہوتا

تم تو اِک نور کی شہنائی ہو سر سے پا تک
زندگی اتنی حسیں ہوگی یہ معلوم نہ تھا

میں ابھی تک دوزخِ دیوانگی میں قید ہوں
جب بیابانوں سے پلٹوں گا تو گھر بھی آئے گا

کس بوجھ سے جسم ٹوٹتا ہے
اتنا تو کڑا سفر نہیں تھا

میں اپنے دکھ کے لاشے پر تیری تقدیر سجالوں گا
بے سود عبادت کا مجھ کو اک دن تو سوگ منانا ہے

تم نے کبھی دیکھا ہوگا جلتے ہوئے جسموں کو یارو
میں گورِ غریباں کی صورت گونگا بہرا اور اندھا ہوں

جاگ اٹھتا ہے جب غم کیا کہیئے
اس وقت کا عالم کیا کہیئے

کیا تعجب پھونک ڈالے روشنی اُس کا بدن
جگمگاتے شہر میں ہرگز نہ ٹھہرانا اسے



سریندر پنڈت سوز

پیدائش ۱۸؍ جولائی ۱۹۳۴ء

وفات ۷؍ ستمبر ۱۹۸۷ء

کھل کر برس گیا تو دھنک چھوڑ جاؤں گا
میں آسماں میں اپنی چمک چھوڑ جاؤں گا